آئینہ کہانی

کے اشرف

ضابطہ

ISBN: **978-1-4507-3838-5**

آئینہ کہانی : کتاب

مصنف : کے اشرف

سالِ اشاعت: 2011

سرورق: چارلس کینٹز

مطبع : سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت : 10 یو ایس ڈالرز

سی ڈبلیو پرنٹرز، 1375 یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا، یو ایس اے

انتساب

اپنی ممانی نور بیگم کے نام

جن سے بچپن میں سنی کہانیوں کی وجہ سے

کہانیاں سننے، سنانے اور لکھنے کا شوق

پیدا ہوا

ترتیب

اظہار تشکر	7
رات کا سورج	9
پیش گفتار	13
آئینے میں قید لڑکی	15
خدا کا زمین پر ایک دن	23
سگرٹ کی بو	33
دہشت گرد	39
فری لانس رپورٹر	43
انقلاب	49
چپہ بھر روٹی	53
حرم	61
عشقِ مجنوں و لیلیٰ	67
نگاہ خانم	73
پاگل	79
غلام	85
خواب اور پتھر	105
پیشگوئیاں	111
جب کھلی آنکھ	115

مجسمہ	119
اجنبی	125
دستخط	129
اور خدا خوشی سے رو پڑا	135
کھڑکی سے باہر سورج	139
خدا کے ساتھ ایک مکالمہ	145
جسم سے باہر ایک دن	151
"زیرو آور"	155
ہیں خواب میں ہنوز	161
صدر محترم	165
کچھ مصنف کے بارے میں	173

اظہار تشکر

کہانیوں کے اس مجموعے کے لیے کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ ان کی تخلیق میں کئی دوستوں کی دادو تحسین شامل ہے۔ وہ یہ کہانیاں پسند نہ کرتے تو شاید ان کا سلسلہ اتنا دراز نہ ہوتا کہ باقاعدہ ایک مجموعہ تشکیل پاتا۔ ان دوستوں کے نام گنوانا چاہوں تو گنوانہ سکوں۔ اگر چند ایک کے نام لکھوں گا تو وہ مسرور ہوں گے لیکن جن کے نام رہ جائیں گے ان کو شکایت پیدا ہوگی۔ اس لیے بغیر کوئی نام لکھے ان سب دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کا حسنِ ظن مہمیز بن کر ہمیشہ مجھے کہانیاں لکھنے پر اکساتا رہا۔

تاہم میں اگر نام لے کر کسی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں تو وہ ہیں قائد اعظم چیئر کے حالیہ ناظم پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب۔ اشتیاق صاحب کی برکلے آمد اور باہمی ربط وضبط سے ہمت پڑی کہ کہانیوں کی اشاعت کا اہتمام کروں۔ انہوں نے جس دقت نظر سے کہانیوں کے مجموعے پر نظر ثانی کی اس سے اس مجموعے کے نکھار اور صحت میں اضافہ ہوا۔

کہانیوں کے اس مجموعے سے پہلے انہوں نے میرے ناول 'مٹی کا بیٹا' اور 'نسلِ سوختہ' پر بھی ایسے ہی دقت نظر سے زبان وبیان کی غلطیاں درست کی تھیں۔ اس سب کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

رات کا سورج

شروع صدی میں تھنک ٹینک پیو نے ایک سروے کیا جس کے نتیجے میں ظاہر ہوا کہ امریکہ کی سرزمین پر چلنے والا ہر چھٹا مسلمان پاکستانی ہے۔ اس تحقیق کے مطابق چونکہ امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی ساٹھ لاکھ سے اوپر ہے اس لیے لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ ان میں دس لاکھ سے زیادہ پاکستانی ہیں۔

آبادی کے ماہرین جن میں امریکی مسلمان بھی شامل ہیں آبادکاروں کے طرز عمل میں ایک منصوبہ دیکھتے ہیں۔ آبادکار خواہ یورپ سے آئے، لاطینی امریکہ سے، افریقہ سے یا ایشیا سے، نئی دنیا میں سب سے پہلے اپنے روٹی روزگار کو یقینی بنانے کی فکر کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ثقافتی ورثے کو سینے سے لگاتا ہے اور آخر میں آبائی وطن کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ امریکی ایسے مسائل کو کس طرح حل کر رہے ہیں۔ یہی حال پاکستانی امریکیوں کا ہے۔

جو پاکستانی امریکی اقتصادی لحاظ سے مستحکم ہو چکے ہیں وہ دو بڑے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اول وہ جنہوں نے اس ملک میں پاکستان کی سیاسی جماعتوں یا مذہبی تنظیموں کی شاخیں قائم کی ہیں اور دوم وہ جو امریکہ کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں سے ربط ضبط بڑھا رہے ہیں۔ یہ دونوں گروہ اختیاری وطن کی امداد سے اپنی سرزمین کی مشکلات کے ازالے کی امید کرتے ہیں۔

خواجہ اشرف موخر الذکر گروہ کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ آبائی وطن کی مذہبی اور سیاسی عصبیتوں کے اثرات سے پاک ہیں۔ پاکستان کے بارے میں جو بہتر سمجھتے ہیں اس کا بلا خوف و خطر اظہار کرتے ہیں۔ انہیں پاکستان کے علاوہ اپنے اختیاری وطن امریکہ سے بھی محبت ہے۔ وہ دونوں ملکوں کو بہتر دیکھنے کے آرزومند ہیں اور بظاہر ان دو محبتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مفکر، شاعر، انشا پرداز اور ایکٹوسٹ خواجہ اشرف کے حال ہی میں دو ناول شائع ہوئے تھے۔ ان کا پونے تین سو صفحات کا ناول "مٹی کا بیٹا" آبائی وطن کے مصائب پر تارکین وطن کی بے چینی کا عکاس ہے۔ یہ ناول بیرونِ پاکستان سے اردو ادب میں ایک خیال افروز اضافہ سمجھا جائے گا۔

یہ ناول وسطی پنجاب کے گاؤں جمال پور کے مکین شیر و اور چوہدری نثار کے تعلقات کی کہانی ہے جو ایک ساتھ پل کر جوان ہوتے ہیں۔ شیر و بالغ ہو کر کمہاروں کا آبائی پیشہ اپناتا ہے جبکہ چوہدری نثار قانون کی ڈگری پا کر وکیل بن جاتا ہے۔ ان کی دوستی ان کے طبقاتی فرق کے باوجود زندگی بھر قائم رہتی ہے۔ یہ ناول پڑھ کر مجھے 114 میکلوڈ روڈ پر سرخ اینٹوں والی وہ دو منزلہ عمارت یاد آئی ہے جہاں پہلے پہل میں نے دانشور فیض احمد فیض کو مزدور لیڈر میرزا ابراہیم کے ماتحت کام کرتے دیکھا تھا۔ میرزا صاحب پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر اور فیض صاحب مزدوروں کی تنظیم کے نائب صدر تھے۔ اگرچہ وہ مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے تعلیمی پس منظر بھی جدا جدا تھے مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مزدوروں کی فلاح و بہبود کا کام کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے کیونکہ فیض صاحب کو معلوم تھا کہ معاشرے کی قیادت محنت کش ہاتھوں میں رہنی چاہیئے اور دانشوروں کو ان کی دانائی سے سیکھنا چاہیئے۔ لاہور میں کرائے کی اس عمارت میں جس کی پیشانی پر مزدوروں کا سرخ پرچم لہراتا تھا میں نے دادا فیروز الدین منصور، سید سبط حسن، لارڈ محمد افضل، لعل خاں اور عبدالسلام کو بھی شانہ بشانہ ضرورت مند ہم وطنوں کی خدمت کرتے دیکھا۔ یہ عمارت پاکستان میں ترقی اور رجائیت کی علامت تھی جسے حکومتوں میں رئیسوں، زمینداروں اور دوسرے کام چوروں کے گماشتوں نے بتدریج تباہ کر دیا۔

خواجہ اشرف کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اقتصادی نظم و نسق کے کسی متبادل طریقے کی تلاش میں ہیں۔ ان کے ناول سے ایک اقتباس: "مکالمہ علم کی بنیاد ہے اور وہ مکالمہ جو چاک پر رکھے اس مٹی کے بوتے کے ساتھ ہو اور جسے کوئی بھی شکل عطا کرنا میری منشا پر منحصر ہو اس میں جو دانش چھپی ہوتی ہے

اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی عالم نہیں کر سکتا۔ ایسی باتیں کرتے ان کی شام کی سیر مکمل ہو جاتی۔ ادھر سورج مغربی افق پر آخری کرنیں بکھیر تا رات کی گود میں اترتا ادھر وہ سیر سے لوٹ کر گاؤں کی حدود میں واپس لوٹ آتے اور اگلے دن دوبارہ شام کی سیر کے لئے ملنے کا وعدہ کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔"

خواجہ اشرف کا دوسرا ناول "نسل سوختہ" طلوع آزادی سے سقوط ڈھاکہ تک پاکستان کی ربع صدی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں ایک آزاد قوم کی تشکیل نو ہونی تھی مگر بدقسمتی سے وہ لسانی، مذہبی ،اقتصادی اور سیاسی مناقشوں میں پھنس کر 1971 میں ٹوٹ گئی۔ "نسل سوختہ" میں وہ سارے کردار موجود ہیں جو اس دور کو بنانے یا بگاڑنے میں مصروف تھے۔ بدقسمتی سے ان کی اولاد آج بھی بر سر اقتدار ہے۔ "نسل سوختہ" پڑھتے ہوئے اس نسل کے قارئین کی آنکھیں بے اختیار بھیگ جاتی ہیں جن کے سامنے پاکستان اس المیے سے دوچار ہوا۔

اب خواجہ اشرف کی تیسری کتاب "آئینہ کہانی" کی نام سے شائع ہونے جا رہی ہے۔ یہ کتاب پچیس کے قریب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی دوسری سے منفرد ہے۔ اس مجموعے میں شامل ہر کہانی حقیقی معنوں میں ایک آئینہ ہے۔ "آئینہ کہانی" میں شامل ہر کہانی نے میرے لیے سوچ کے کئی نئے دریچے کھولے۔

رات کا سورج ان کی ایک آزاد نظم کا ٹائٹل ہے۔ مجھے لگتا ہے خواجہ اشرف رات کا وہ سورج ہے جو سماجی، سیاسی اور اقتصادی ناانصافیوں کی تاریکیوں سے لڑ رہا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تینوں کتابیں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

اکمل علیمی
وائس آف امریکہ
واشنگٹن، ڈی سی۔ امریکہ

پیش گفتار

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں تو شاید میرے لیے اس سوال کا جواب دینا ممکن نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے آج تک خود سے یہ سوال کبھی نہیں پوچھا۔ بس کہانی لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ کاغذ قلم لیکر بیٹھ جاتا ہوں اور کسی شاعر کی غزل کی طرح کہانی ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھار کہانی لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن ذہن میں کوئی آئیڈیا نہیں ہوتا کہ کونسی کہانی لکھی جائے۔ پھر چند جملے لکھتا ہوں تو کہانی کے نقش و نگار ابھرنے لگتے ہیں۔ کوئی ایک کردار ذہن میں آکر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کہ میرے بارے میں لکھو۔

میں اپنے کردار کا کہا مان کر اس کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔ وہ جہاں لے جاتا ہے اس کے ساتھ جاتا ہوں۔ جہاں بیٹھنے کو کہتا ہے بیٹھ جاتا ہوں، جہاں کھڑا ہونے کو کہتا ہے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے جدا ہوتا ہے تو کہانی مکمل ہو چکی ہوتی ہے۔

کہانیاں اور ناول لکھنے سے پہلے مجھے احساس نہیں تھا کہ کہانیوں اور ناولوں کے کردار بالکل حقیقی ہوتے ہیں۔ ہم انسانوں کی طرح۔

میں نہیں جانتا کہ دوسرے لکھنے والے کیا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے کرداروں سے ایک انسیت ہو جاتی ہے۔ میرا ان کے ساتھ ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے آس پاس پھر رہے ہیں۔ کئی ایک سے میری دوستی ہو جاتی ہے۔ ان کے دکھ میرے دکھ بن جاتے ہیں اور ان کی خوشیاں میری خوشیاں بن جاتی ہیں۔ ان کے دکھوں پر میں ان کے ساتھ مل کر آنسو بہاتا ہوں اور ان کی خوشیوں پر ان کے ساتھ مل کر بھنگڑا اڈالتا ہوں۔

کہانیاں لکھنے کے بارے میں میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں۔ اب اس بارے کہ میں نے کب کہانیاں لکھنی شروع کی تھیں۔ اس کا بھی مجھے کچھ ٹھیک اندازہ نہیں۔ میں آپ کے سامنے

کسی شاعر کی طرح ہر گز یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں نے پہلی کہانی پانچویں یا چھٹی جماعت میں لکھی تھی۔ ہاں مجھے یہ یاد ہے کہ میرے کچھ انشایئے ڈاکٹر وزیر آغا کے پرچے اوراق میں ستر کی دہائی میں شائع ہوئے تھے۔

کچھ کہانیاں اوراق اور انڈیا سے شائع ہونے والے ادبی رسالے شب خون میں ۸۰ کی دہائی کے آغاز میں شائع ہوئی تھیں۔

اس دوران کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ چھپتا رہا۔ کبھی اردو میں کبھی انگریزی میں۔ کبھی کسی اخبار میں کبھی کسی رسالے میں۔

پچھلے سال کچھ فرصت میسر آئی تو یکے بعد دیگرے دو ناول لکھے۔ مٹی کا بیٹا اور نسل سوختہ۔ علمی اور ادبی حلقوں میں دونوں کو پذیرائی حاصل ہوئی۔

اب اپنی کہانیاں "آئینہ کہانی" کی صورت میں آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ اس مجموعے میں شامل کہانیاں آپ پر کیا تاثر چھوڑتی ہیں مجھے اس کا اندازہ نہیں۔ میں نے یہ کہانیاں لکھیں، آپ پڑھ رہے ہیں۔ جس طرح یہ کہانیاں لکھنا میرا حق تھا اسی طرح یہ کہانیاں پڑھنا اور ان کے بارے میں رائے کا اظہار کرنا آپ کا حق ہے۔ اگر آپ اپنی رائے مجھ تک پہنچانا چاہیں تو میں ہمہ تن گوش ہوں۔ آپ کی رائے جان کر مجھے خوشی ہو گی۔

کے اشرف
1375 یونیورسٹی ایونیو،
برکلے، کیلیفورنیا 94702
یو ایس اے
Email: kashraf@ix.netcom.com

آئینے میں قید لڑکی

دن چڑھے رشید کی آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی لڑکی اس کے آس پاس سسکیاں بھر رہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اس لیے سسکیوں کی آواز پر اسے تعجب ہوا جو رفتہ خوف بن کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسرانے لگا۔ اس نے سوچا اس کے علاوہ اس گھر میں اور کوئی موجود نہیں تو پھر یہ سسکیاں کون بھر رہا ہے؟

اس نے اپنے کمرے کا بغور جائزہ لیا لیکن وہاں اس کے علاوہ کوئِ اور موجود نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم اور کچن کا جائزہ لیا لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا لیکن سسکیوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

آخر اس نے پوری توجہ سے سسکیوں کی آواز سن کر اس کے ماخذ تک پہنچنا چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ آواز اس کے کمرے اور باتھ روم کی مشترکہ دیوار پر آویزاں قدِ آدم آئینے سے آرہی تھی۔

آئینے سے سسکیوں کی آواز آتے سن کر رشید کے ہوش و حواس خوف سے شل ہونا شروع ہو گئے۔ اس کو ہمت نہ ہوئی کہ آئینے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے اور جاننے کی کوشش کرے کہ آخر آئینے سے سسکیوں کی آواز کیوں آرہی ہے۔ تھوڑی دیر تک خوف میں مبتلا رہنے کے بعد رشید کے حواس کچھ کچھ نارمل ہوئے تو اس نے ہمت کر کے آئینے کی طرف دیکھا۔ اسے آئینے کے اندر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان لڑکی دکھائی دی جو زانوؤں پر سر نیوڑھائے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔

آج سے پہلے جب بھی رشید نے آئینہ دیکھا اسے ہمیشہ آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ وہ روزانہ نہانے سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے روانہ ہونے سے پہلے قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے سراپا کا جائزہ لیتا۔

آج صبح جب وہ سو کر اٹھا، کمرے میں مسلسل آنے والی سسکیوں کی آواز نے اس کے روز مرہ کے معمولات منتشر کر دیئے۔ اسے نہ باتھ روم جانا یاد رہا، نہ دانت صاف کرنا، نہ شیو بنانا، نہ غسل کرنا، اور نہ دفتر جانے کے لیے کپڑے تبدیل کرنا۔ اس کی ساری توجہ پہلے سسکیوں پر مرکوز تھی اور پھر آئینے میں

بیٹھی، سفید کپڑوں میں ملبوس، زانوؤں پر سر رکھے بیٹھی خوبصورت لڑکی پر۔ وہ پریشان تھا کہ آخر آئینے میں بیٹھی لڑکی کون ہے، وہ آئینے کے اندر کیسے پہنچی ہے۔ اور آئینے میں حقیقی عمق کے نہ ہونے کے باوجود وہ کیسے وہاں ایک جیتی جاگتی لڑکی کی طرح بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہے۔ ان سوالوں سے پریشان، وہ ہمت کر کے آئینے کے سامنے پہنچا اور چند لمحوں تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس لڑکی کی سسکیوں کی آواز سنتا رہا اور اسے پر تجسس نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

وہ لڑکی اس کے وجود سے بے خبر اسی طرح زانوؤں پر سر جھکائے سسکیاں بھرتی رہی۔ وہ سوچتا رہا اس لڑکی سے بات کرے تو کیسے؟ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے تو کیسے؟ بظاہر وہ لڑکی آئینے کے اندر تھی اور اس تک اس کی آواز پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے اپنی انگلیوں سے آئینے پر ٹھک ٹھک کی لیکن آئینے کے اندر لڑکی اسی طرح اس کی آمد سے بے خبر زانوؤں پر سر رکھے سسکیاں بھرتی رہی۔ لڑکی کا چہرہ زانوؤں میں چھپا ہونے کی وجہ سے وہ ابھی تک اس کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس کے کومل بازووں اور پیروں سے اوپر تھوڑی سی نظر آتی سفید ٹانگوں اور سر کے چمکتے زندگی سے بھرپور سیاہ بالوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے جو آئینے میں قید ہے۔

اس کی سسکیوں کی آواز کا کنوارپن بھی اس کے اندازے کی تائید کر رہا تھا۔ اس کی آواز کی نرماہٹ اور رسیلا پن صاف بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی عورت پن سے دور ابھی نو عمری کی دہلیز پر کھڑی ہے

رشید کی اپنی عمر بھی ابھی زیادہ نہیں تھی۔ حال ہی میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک انٹر نیشنل کمپیوٹر کمپنی میں کام شروع کیا تھا۔ جس گھر میں وہ آئینے میں قید لڑکی کے روبرو کھڑا تھا یہ بھی اسے کمپنی نے فراہم کر رکھا تھا۔ گھر کے علاوہ کمپنی نے اسے گاڑی بھی مہیا کی تھی جسے عام طور پر وہ کام پر آنے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

گھر اگرچہ چھوٹا تھا لیکن اسے اس طرح سے ڈیزائین کیا گیا تھا کہ یہاں رہنے والے کو زندگی کا تمام آرام میسر ہو اور وہ اپنے قیام سے لطف اندوز ہو سکے۔ گھر تقریباً تمام جدید سہولیات سے مزّین تھا۔

گھر کے بیرونی گیٹ سے داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ گیٹ کے اندر گاڑی پارک کرنے کی جگہ تھی۔ سامنے ڈرائنگ روم تھا۔ جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈائننگ روم تھا جو دیکھنے میں ڈرائنگ روم کا ہی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ کچن اور کچن کے ساتھ آگے مختصر سے ہال وے کے بعد بیڈ روم تھا جس کے ساتھ ایک کشادہ باتھ روم تھا جسے گھر کا مکین اور ڈرائنگ روم میں آنے والے مہمان مشترکہ طور پر استعمال کر سکتے تھے۔

اسی جگہ خواب گاہ اور باتھ روم کی مشترکہ دیوار پر ہال وے میں آویزاں وہ آئینہ تھا جس میں قید وہ اجنبی لڑکی زانوؤں پر سر رکھے مسلسل سسکیاں بھر رہی تھی۔

جب آئینے پر بار بار ٹھک ٹھک کرنے سے لڑکی رشید کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اس نے ہمت کر کے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "محترمہ آپ کون ہیں اور یہاں سسکیاں کیوں بھر رہی ہیں؟"

آئینے پر ٹھک ٹھک کا جواب نہ دینے والی لڑکی نے رشید کا سوال سن لیا تھا۔ اس کے سوال پر اس نے سر اٹھا کر رشید کی طرف دیکھا تو اس کے حسن کی چمک سے رشید کے اوسان اس طرح خطا ہوئے کہ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

آج تک اس نے اتنی خوبصورت، زندگی سے ایسی بھرپور نوجوان لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی نے بظاہر رشید کا سوال سن لیا تھا لیکن اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ یونہی بیٹھی، زانوؤں پر دونوں ہاتھ رکھے، سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی دید میں ایک سحر تھا، ایک بات تھی، اور ایک راز تھا۔ آئینے میں قید تنہا نوجوان لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے سسکیاں بھر رہی تھی اب خاموش بیٹھی گہری نظروں سے رشید کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

رشید نے پھر اپنا سوال دہرایا: "محترمہ آپ کون ہیں اور اس آئینے میں کیا کر رہی ہیں؟"

اس بار لڑکی رشید کا سوال سن کر آہستگی سے اپنے پیروں پر اس طرح کھڑی ہوئی کہ رشید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے لیے لڑکی کے خوبصورت سراپا کو نظر بھر دیکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

"میں اس آئینے کی قیدی ہوں۔" لڑکی کے جواب میں چھپے کرب سے رشید بھی سسکیاں بھرنے لگا۔ اب تک اس نے کئی طرح کے قیدی دیکھے تھے، قیدیوں کی کہانیاں پڑھی تھیں لیکن آئینے کے کسی قیدی کے بارے میں نہ اس نے کبھی سنا نہ ایسے قیدی سے اس کا کبھی سامنا ہوا۔

"محترمہ میں اس بات کے ادراک سے قاصر ہوں کہ کوئی شخص آئینے میں کیسے قید ہو سکتا ہے۔"

"ہاں جب تک میں آئینے میں قید نہیں ہوئی تھی یہ بات میرے ادراک سے بھی باہر تھی۔"

"لیکن اس آئینے کے اندر آپ کیسے پہنچیں۔؟" رشید نے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے آئینے میں قید لڑکی کی صورت حال سمجھنے کی کوشش کی۔

"آپ چونکہ آئینے سے باہر ہیں اس لیے آپ آئینے کی اندر کی دنیا کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔" لڑکی نے رشید کا تعجب کم کرنے کے لیے جواب دیا۔

"لیکن محترمہ کیا آپ زندہ ہیں؟" رشید نے مزید متعجب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"مجھے تو آپ زندہ دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ زندگی اس طرح آپ کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہے کہ میرا جی چاہتا ہے میں آگے بڑھ کر آپ کو تھام لوں اور آپ کے وجود کو محسوس کروں۔"

"یہ آپ نہیں کر سکتے کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان آئینہ حائل ہے۔ نہ میں آئینے سے باہر آسکتی ہوں نہ آپ اس کے اندر آسکتے ہیں۔ چنانچہ آپ چاہنے کے باوجود میرے وجود کو تھام کر اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔" لڑکی نے مترنم آواز سے جواب دیا۔ آئینے میں قید لڑکی سے باتیں کرتے رشید کو وقت گزرنے کا کچھ احساس نہ ہوا۔

وہ صبح اٹھنے کے بعد روز مرہ کے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد دفتر جانے کی بجائے اسی طرح آئینے کے سامنے کھڑا اس لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔

اسی چکر میں نہ وہ دفتر گیا نہ دفتر کال کر کے اس نے کسی کو بتایا کہ وہ آج دفتر نہیں آئے گا۔ جیسے جیسے رشید آئینے میں قید لڑکی سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں رشید کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ وہ تھی ہی اتنی جاذبِ نظر اور خوبصورت کہ اگر کوئی اور بھی اسے دیکھتا تو اسی طرح اس کے حسن میں گرفتار ہو جاتا۔

رشید اس سے ایک سوال کرتا تو وہ ایسے دلکش انداز میں اتنی سادگی کے ساتھ ایسا تہہ دار جواب دیتی کہ اس میں سے سو سوال اور جنم لیتے۔

آئینے میں قید لڑکی کے ساتھ انہی سوالوں اور جوابوں میں رشید کے گھنٹے پہروں میں اور پہر دنوں میں تبدیل ہو گئے۔

اس کے کئی دن دفتر نہ جانے کی وجہ سے اس کے دفتر کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں تشویش ہوئی۔ پہلے انہوں نے اس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کئی دن تک اس سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔

یہاں کئی راتیں اور دن گزرنے کے باوجود آئینے میں قید لڑکی اور رشید کے درمیان سوال و جواب کا ایک سلسلہ تھا جو پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ نہ رشید کے سوال ختم ہو رہے تھے نہ آئینے میں قید لڑکی کے جواب۔

رشید اس سے سوال پر سوال کئے جا رہا تھا اور وہ انتہائی آرام سے اس کے سب سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ تھکن تھی اور نہ بوریت۔ رشید سے گفتگو کرنے کی وجہ سے اب اس کی سسکیاں بھی رُک چکی تھیں۔ اور وہ رشید کے ساتھ گفتگو میں اس طرح مگن تھی جیسے وہ رشید کی زندگی کا حصہ ہو اور وہ اس کی زندگی کا۔

"آپ آئینے میں قید ہیں تو آپ کھاتی پیتی کیا ہیں؟" رشید نے حیرت سے لڑکی سے سوال کیا۔

"آئینے کی قید ایک عجیب و غریب قید ہے۔ جیسے ہی ایک شخص اس قید میں پہنچتا ہے وہ کھانے پینے کی ضرورتوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نہ اسے بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ نہ اسے تھکن کا احساس ہوتا ہے اور نہ سونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ جس حالت میں ہوتا ہے اسی حالت میں رہتا ہے۔

میں اس وقت جیسی آپ کو نظر آرہی ہوں۔ اس قید میں آتے وقت ایسی ہی تھی۔ یہی لباس زیب تن تھا۔ ایسے ہی بال بنے ہوئے تھے۔ بالکل اب بھی اسی طرح ہوں جیسے یہاں لائی گئی تھی۔"

"لیکن آپ کب سے اس آئینے میں قید ہیں؟" رشید نے ایک اور سوال پوچھا۔

"مجھے وہ لمحہ صحیح طور پر یاد نہیں جب مجھے آئینے کی اس قید میں دھکیل دیا گیا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ میں نے چاند کی طرف دیکھا اور چاند مجھے اچھا لگا۔ میں نے چاند کی طرف اپنے بازوؤ پھیلائے تا کہ اسے تھام لوں۔ عین اس لمحے مجھے اس قید میں دھکیل دیا گیا۔"

"اور تب سے اب تک آپ ویسی ہی ہیں جیسی اس قید میں آئی تھیں۔"

"ہاں۔ وقت کو اس آئینے کے اندر رسائی حاصل نہیں۔ اس لیے یہاں کسی چیز پر گردشِ ایام کا اثر نہیں ہوتا۔ گزرتے شب وروز کے اثرات اس آئینے سے باہر کی چیزیں ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ زانوؤں پر سر رکھے سسکیاں کیوں بھر رہی تھیں؟"

"اسے آپ احساس تنہائی کہہ لیں یا اس قید سے نجات پانے کی خواہش۔"

"میں اس سلسے میں آپ کی کیسے مدد کر سکتا ہوں؟" رشید نے آئینے میں قید لڑکی سے پوچھا۔

"میری مدد کرنے کے لیے آپ کو آئینے کے اندر آنا ہو گا یا مجھے آئینے سے باہر۔ میں خود بخود آئینے سے باہر نہیں آسکتی۔ یہاں سے مجھے باہر لے جانے کے لیے آپ کو آئینے کے اندر آنا ہو گا"

"لیکن میں آئینے کے اندر کیسے آسکتا ہوں۔ اگر میں نے کسی طرح آئینے میں گھسنے کی کوشش کی تو آئینہ ٹوٹ جائے گا۔ اور آئینہ ٹوٹ گیا تو آپ آئینے کے ساتھ بکھر جائیں گی۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ اچھا خیال نہیں۔ کسی طرح آپ کو آئینے سے خود باہر آنا ہو گا۔"

"میں آئینے میں قید ہوں۔ قیدی کو قید سے باہر آنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی کو اسے قید سے رہائی دلانی پڑتی ہے۔ اگر میں خود رہا ہو سکتی تو آپ مجھے یہاں سسکیاں بھرتے نہ پاتے۔ اس لیے آپ کسی طرح آئینے کے اندر آنے کی ترکیب کریں۔ اور مجھے اپنے ساتھ یہاں سے باہر نکال لے جائیں۔" لڑکی نے رشید سے التجا کی۔

"لیکن آپ یہ بھی تو بتائیں کہ میں آئینے کے اندر آؤں کیسے ؟"

"کاش میں یہ جانتی کہ آپ آئینے کے اندر کیسے آسکتے ہیں۔ لگتا ہے آئینے کی قید سے رہائی میری قسمت میں نہیں۔ اور پھر وہ ہلکے ہلکے دوبارہ سسکیاں بھرنے لگی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ پلیز آپ دوبارہ سسکیاں نہ بھریں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آئینے کے اندر جانے کی تدبیر کرنے لگا۔

یہاں رشید اور آئینے میں قید لڑکی انہی تدبیروں میں گم تھے اور ادھر پولیس رشید کی بازیابی کے لیے اسے ادھر ادھر ڈھونڈنے سے تھک کر اس کے گھر پہنچی تا کہ وہاں سے اس کی گمشدگی کی تحقیقات کا سلسلہ شروع کر سکے۔

پولیس افسر بہت دیر تک اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ جب کسی نے گھر کے اندر سے جواب نہیں دیا تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلے آئے۔

گھر میں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے گھر میں ہر جگہ کوئی نشان ڈھونڈھنے کی کوشش کی جس سے انہیں اپنی تفتیش کے لیے کوئی نقطہ آغاز مل سکے۔ لیکن انہیں کہیں کوئی نشان نہ ملا۔

وہ تھک ہار کر جانے لگے تو ایک پولیس افسر کی باتھ روم اور خواب گاہ کی مشترکہ دیوار پر آویزاں قد آدم آئینے پر نظر پڑی۔ اس نے دیکھا آئینے پر چند قدموں کے نشان تھے جو کہیں نہیں جارہے تھے۔

خدا کا زمین پر ایک دن

ابھی اس نے سرخ بتی کے اشارے کو توڑا ہی تھا کہ اس کی گاڑی کے پیچھے پولیس والے نے اپنی گاڑی کی لائٹیں آن کر کے اسے رکنے کا اشارہ دیا لیکن وہ سرخ بتی کی طرح پولیس والے کی گاڑی کی چھت پر جلتی لائٹوں کو بھی قابل توجہ نہ سمجھتے ہوے اسی طرح گاڑی دوڑاتا رہا۔

پولیس والے نے جب اسے رکنے کے موڈ میں نہ دیکھا تو اس نے وائرلیس پر پولیس اسٹیشن سے مزید نفری طلب کی۔ تھوڑی دیر میں پولیس کی کئی گاڑیاں اپنی لائٹیں اور ہوٹر آن کئے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

وہ پھر بھی پوری اسپیڈ سے گاڑی بھگاتا رہا۔ چند پولیس والوں نے دوسرے راستے سے جا کر اپنی گاڑیاں اس کی گاڑی کی آگے لگا کر اس کی گاڑی کی اسپیڈ کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل اسی اسپیڈ پر گاڑی بھگاتا رہا۔ جب وہ پولیس والوں کے مسلسل تعاقب اور وارننگز سے رکنے پر تیار نہ ہوا تو اس کی گاڑی کے عین عقب والے پولیس آفیسر نے اس کی گاڑی کے پچھلے ٹائروں پر فائر کر کے اس کی گاڑی کے دونوں ٹائروں کو پنکچر کر دیا۔ ٹائر پھٹنے کے بعد اس کی گاڑی کے پچھلے پہیوں سے سڑک سے رگڑنے کی وجہ سے چنگارے نکلنا شروع ہوئے تو اس نے گاڑی روک دی۔

اس کی گاڑی کے رکتے ہی پولیس کی گاڑیوں نے اس کی گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پولیس والوں نے اس پر اپنے ریوالور تان کر اسے وارننگ دی کہ وہ ہاتھ اوپر اُٹھا کر گاڑی سے باہر آئے اور منہ کے بل زمین پر لیٹ جائے۔ لیکن وہ پولیس والوں کی مسلسل وارننگ کے باوجود گاڑی میں بیٹھا رہا۔

جب پولیس والوں نے دیکھا کہ وہ گاڑی سے باہر نہیں آ رہا تو انھوں نے اس پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن ان کی فائرنگ کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور اسی طرح ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا رہا۔

پولیس والوں کی ساری گولیاں اس کے دائیں بائیں سے گزرتی رہیں اور کوئی گولی اس کے وجود سے چھو کر نہ گزری۔

کافی دیر گولیاں برسانے کے بعد جب پولیس کی ساری نفری کے پاس ساری گولیاں ختم ہوئیں تو آخر انہوں نے اپنے دستی اسپیکر پر اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

ان کے سوال پر اس نے جواب دیا کہ وہ خدا ہے اور آج ہی آسمان سے زمین پر آیا ہے۔ یہاں کے قوانین سے واقف نہیں۔ اس لیے انہیں اس کے رویے پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔

پولیس والوں نے پوچھا کہ وہ کیسے یقین کریں کہ وہ خدا ہے۔ اس نے کہا کہ انہوں نے اس کی گاڑی بالکل تباہ کر دی ہے لیکن یہ گاڑی از سر نو ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھیک ہو جائے گی۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتا دیکھیں تو وہ اس کے راستے کی دیوار نہ بنیں اور اسے جانے دیں۔

خدا کا مطالبہ سن کر پولیس والے نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ اسے جانے دیں گے لیکن وہ ازراہ کرم سبز اور سرخ بتیوں کا خیال رکھے۔ اسپیڈ کی حدود کے مطابق گاڑی چلانے کا وعدہ کرے، تو وہ اس سے تعرض نہیں کریں گے۔

خدا نے پولیس والوں کو اپنے مطالبے سے رضامند دیکھا تو اس نے چشم زدن میں اپنے خیال کی طاقت سے اپنی گاڑی کو از سر نو درست کیا اور پھر گاڑی چلا دی۔ خلاف معمول، خدا کو گاڑی چلانے کے لیے عام ڈرائیوروں کی طرح اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھنے یا پٹرول کے پیڈل پر پاؤں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس اس کے خیال کی طاقت سے پٹرول کا پیڈل ضرورت کے مطابق اوپر نیچے ہو رہا تھا اور گاڑی کا اسٹیرنگ خود بخود گھوم کر گاڑی کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔

جب خدا نے اپنی گاڑی دوبارہ چلانا شروع کی پولیس والوں نے شہر کے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں کے ذریعے شہر کے تمام باشندوں کو شہر میں خدا کی موجودگی اور گاڑی چلانے کی اطلاع دی۔ اپنے اعلان میں

انہوں نے شہریوں کو بتایا کہ خدا اس شہر میں نووارد ہے۔ ٹریفک کے قوانین نہیں جانتا۔ اس لیے اگر وہ اس رنگ اور اس ماڈل کی گاڑی سڑک پر دوڑتی دیکھیں تو فوراً اسے راستہ دے دیں۔

خدا کافی دیر تک شہر کی سڑکوں پر گاڑی چلاتا رہا۔ گاڑی چلاتے چلاتے اچانک اس کی نظر ایک سنا گاگ پر پڑی۔ سنا گاگ دیکھ کر خدا نے گاڑی عین سنا گاگ کے سامنے روکی، گاڑی کے شیشے میں اپنے حلیے کا جائزہ لیا اور سنا گاگ کے اندر چلا گیا۔

کسی نے اس کی سنا گاگ کے اندر آمد پر توجہ نہ دی۔ وہ کافی دیر تک سنا گاگ میں بیٹھے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ہل ہل کر انہماک کے ساتھ تورات کی تلاوت کرتے دیکھتا رہا۔

جب کافی دیر تک کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہ لیا اس نے سنا گاگ کے ربائی کے پاس جا کر اس کے کان میں کہا کہ وہ خدا ہے۔ آج ہی آسمان سے آیا ہے۔ ان کے ساتھ سنا گاگ میں ایک دن گزارنا چاہتا ہے۔ کل واپس آسمان پر چلا جائے گا۔

ربائی نے خشمگیں نگاہوں سے خدا کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر بولا:

"اے اجنبی، مجھے شک ہے کہ تمہاری ذہنی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ بہتر ہو گا تم یہاں سے جاؤ اور کسی ہسپتال میں اپنا معائنہ کراؤ۔"

خدا نے ربائی کی بات سنی تو مسکراتے ہوئے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی:

"اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں۔ تو پھر تم اوپر جانے کی تیاری کرو۔ میں اسی وقت تمہیں اِس دنیا سے اُس دنیا میں پہنچانے جا رہا ہوں۔"

خدا کی بات سن کر ربائی نے شور مچانا شروع کر دیا:

"فلسطینی دہشت گرد، فلسطینی دہشت گرد۔"

خوف سے ربائی کی آواز کسی خراب لاوڈ اسپیکر کی طرح پھٹنے لگی تو سنا گاگ میں تورات کی تلاوت کرتے بنی اسرائیل کے بیٹوں نے تھوڑی دیر کے لیے تلاوت روک کر سنا گاگ میں نووارد کی طرف دیکھا اور

پھر تورات کو وہیں پھینک کر "فلسطینی دہشت گرد، فلسطینی دہشت گرد" کا شور مچاتے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

کسی اجنبی نے سنا گاگ سے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو اس طرح سرپٹ بھاگتے دیکھا تو اس نے پولیس کو کال کر دی۔ پولیس کے ڈسپیچر نے سنا گاگ میں ایمرجنسی کی کال دی تو پورے شہر کے پولیس والے اپنی گاڑیوں کی لائٹیں جلائے، ہوٹروں سے شور مچاتے وہاں پہنچے تو انہوں نے خدا کو سکون سے اپنی گاڑی میں بیٹھے دیکھا۔

پولیس والے پہلے ہی اپنے ریوالوروں کی سب گولیاں اس پر برسا چکے تھے۔ انہوں نے دوبارہ خدا کو دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اسپیکر پر خدا کو وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ صبح انہوں نے اسے ٹریفک کی خلاف ورزی کے باوجود جانے دیا تھا لیکن اب اس نے سنا گاگ میں بدامنی پیدا کی تھی چنانچہ اب وہ اسے ہر صورت گرفتار کر کے حوالات میں بند کریں گے اور اگلے دن اسے عدالت میں جج کے سامنے پیش کریں گے۔

خدا نے کہا: "دیکھو میں خدا ہوں۔ تم چاہو بھی تو مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ نہ تمہارے پاس وہ بندوقیں ہیں جو گولی سے مجھے زخمی کر سکیں اور نہ وہ ہتھکڑیاں جو تم میرے ہاتھوں میں ڈال کر مجھے گرفتار کر سکو۔ اگر تم چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ اگر تم کوشش نہ کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ تمہارا بھرم تمہاری نظروں میں قائم رہے گا۔ لیکن اگر تم نے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی اور تم مجھے گرفتار نہ کر سکے تو تمہارا اعتماد مجروح ہو گا۔ اور اس طرح آئندہ تمہارے لیے اصل مجرموں کو گرفتار کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

پولیس والوں نے خدا کی بات سنی تو آپس میں مشورے کے بعد اس سے درخواست کی کہ وہ اسے جانے دیں گے لیکن ازراہ کرام اب نہ وہ ٹریفک کی خلاف ورزی کرے اور نہ کسی سنا گاگ میں جا کر بنی اسرائیل کے بیٹوں کو بلاوجہ ہراساں کرے۔

خدا نے کہا کہ اس نے پہلے ہی اپنے وعدے کے مطابق صبح سے ٹریفک کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ اب وہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ کسی سناگاگ میں جا کر بنی اسرائیل کے بیٹوں یا بیٹیوں کو پریشان نہیں کرے گا۔

پولیس والوں نے خدا کے الفاظ میں سچائی کا نور جھلکتا دیکھا تو انہوں نے اسے دوبارہ جانے دیا۔

خدا نے پھر اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور دوبارہ شہر کی سڑکوں پر آوارگی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

وہ کافی دیر تک شہر کی سڑکوں پر اِدھر اُدھر گاڑی دوڑاتا رہا۔ جہاں ٹریفک کی لائٹ سبز ہوتی وہاں رکے بغیر گزر جاتا۔ جہاں لائٹ سرخ ہوتی وہاں رک جاتا۔ لیکن چونکہ اس کی گاڑی اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے بغیر چل رہی تھی۔ اسے اس طرح گاڑی چلاتے دیکھ کر کئی ڈرائیور اپنی گاڑیاں دوسرے ڈرائیوروں سے ٹکرا چکے تھے۔

خدا کی گاڑی کے ارد گرد ہونے والے گاڑیوں کے حادثات کی وجہ سے پولیس، فائر ڈیپارٹمنٹ اور ایمبولینسوں کی پورے شہر میں دوڑ لگی تھی۔ ابھی وہ ایک حادثے سے فارغ نہیں ہونے پاتے تھے کہ کسی اور جگہ حادثہ ہو جاتا۔ ابھی وہ نئی جائے حادثہ پر پہنچتے نہیں تھے کہ کسی تیسری جگہ سے حادثے کی اطلاع مل جاتی۔

اس دوران خدا نے ایک جگہ ایک چرچ دیکھا۔ اسے چرچ کے اندر سے اپنے بیٹے یسوع مسیح کی تعریف میں گائے جانے والے گیتوں کی آواز آئی تو وہ گاڑی روک کر چرچ کے اندر چلا گیا۔ چرچ کے اندر مردوں اور عورتوں کا ایک گروپ پرپل کلر کے گاؤن پہنے حمدیہ گیت گا رہا تھا۔ باقی سب حاضرین، مرد اور عورتیں، ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے، پرپل گاؤن پہنے گروپ میں شامل گانے والوں کی پیروی کر رہے تھے۔ خدا بھی ان کے ساتھ اپنے بیٹے یسوع مسیح کے لیے حمدیہ گیت گانے میں شامل ہو گیا۔ اسے چرچ میں حمدیہ گیت گانے والوں کے ساتھ مل کر گانا اچھا لگا۔

ابھی چرچ میں حمدیہ گیت جاری تھے کہ پادری کی نظر خدا پر پڑی۔ پادری نے استفہامیہ نظروں سے خدا کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں خدا سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ خدا نے پادری کی استفہامیہ

نظروں کا نظروں ہی نظروں میں جواب دیا کہ وہ خدا ہے اور آج کا دن ان کے ساتھ ان کے چرچ میں گزارنا چاہتا ہے۔

خدا کے جواب کی پادری کو کچھ سمجھ آئی کچھ نہ آئی۔ اس نے دوبارہ گھورتے ہوئے خدا کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں درشتگی کے ساتھ دوبارہ پوچھا کہ وہ کون ہے۔ خدا نے پھر اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں جواب دیا کہ وہ خدا ہے اور آج کا دن ان کے ساتھ ان کے چرچ میں گزارنا چاہتا ہے۔

پادری نے خدا کی چھید جانے والی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے خوف زدہ آواز میں چیخنا شروع کر دیا: " مسلم دہشت گرد، مسلم دہشت گرد۔"

چرچ میں سب حاضرین سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ نہ کسی کو خدا یاد رہا نہ خدا کا بیٹا۔ پادری صاحب بھی خوف سے بے ہوش ہو کر فلور پر ڈھیر ہو گئے اور ان کی روح فوراً ہی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ چرچ میں بھگدڑ مچی تو کسی نے پھر پولیس کو فون کیا کہ کوئی مسلم دہشت گرد چرچ میں آگھسا ہے۔

پھر شہر کے سارے پولیس والے گاڑیاں بھگاتے، ہوٹر بجاتے، چرچ پہنچے تو خدا کو اپنی گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ چیں بجبیں ہو کر دستی اسپیکر نکال کر غرّاتے ہوئے خدا سے بولے کہ پہلے تم نے دبا کر ٹریفک کی خلاف ورزیاں کی ہیں، پھر سنا گاگ میں ادھم مچایا، اپنی بے ہنگم حرکتوں سے سڑکوں پر حادثات کا باعث بنے، جس میں کئی لوگ مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے، اور اب چرچ میں آکر عبادت میں مصروف لوگوں کے امن میں خلل ڈالنے کے سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔ ہماری گولیاں تم پر اثر نہیں کرتیں۔ چاہتے ہوئے بھی ہم تمہیں پکڑ نہیں سکتے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں تم واپس آسمان پر نہیں چلے جاتے تاکہ ہم چین سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ خدا نے پولیس والوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹریفک کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس نے صبح والی ٹریفک کی خلاف ورزیوں کے بعد کوئی اور خلاف ورزی نہیں کی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ سنا گاگ

جا کر بنی اسرائیل کے بیٹوں کو تنگ نہیں کرے گا۔ وعدے کے مطابق وہ اس کے بعد کسی سناگاگ میں بھی نہیں گیا۔

اس نے انہیں بتایا کہ وہ اپنی گاڑی پر آرام و سکون سے ٹریفک کے تمام قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ چرچ میں لوگ اس کے بیٹے یسوع مسیح کے لیے حمدیہ گیت گا رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یسوع مسیح کے باپ کو اپنے درمیان پا کر خوش ہوں گے۔ لیکن مجھ سے نظریں ملتے ہی پہلے پادری صاحب نے زیر لب کچھ کہا اس کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گرے اور فوت ہو گئے جب کہ باقی سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ تمہاری گولیاں مجھے مار سکتی ہیں۔ نہ تمہاری ہتھکڑیاں مجھے روک سکتی ہیں۔ میں خود ہی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کسی سناگاگ یا کسی چرچ میں نہیں جاؤں گا۔

پولیس والوں نے پھر خدا کے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے اسے جانے دیا۔ ویسے بھی ان کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ کرتے بھی تو کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ اسے جانے دیں۔

خدا نے پھر اپنی گاڑی کو ٹریفک کے اصولوں کے عین مطابق حرکت دی اور تمام قوانین کی پابندی کرتے ہوئے رفتہ رفتہ شہر کی سڑکوں پر آوارگی کرنے لگا۔

اگر اسے کہیں کوئی دل چسپ نیون سائن نظر آتا تو وہ رک کر اسے غور سے دیکھتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ کہیں کوئی خوبصورت لڑکی فٹ پاتھ پر چلتی دکھائی دیتی تو چند لمحے رک کر سر سے پیروں تک اس کے سراپا کا جائزہ لیتا، زیر لب اس کی تعریف کرتا، اور پھر گاڑی کو گیر میں ڈال کر آگے بڑھ جاتا۔

یونہی گھومتے پھرتے اسے ایک جگہ ایک مسجد دکھائی دی۔ وہ کافی دیر تک گاڑی مسجد کے باہر پارک کر کے مسجد میں آنے جانے والوں کو گھورتا رہا۔

اُس کے اس طرح ہر آنے جانے والے کو گھورتے ہوئے غور سے دیکھنے کا سب نے نوٹس لیا۔ کچھ لوگوں نے باقاعدہ امام مسجد سے شکایت کی۔

ابھی لوگ امام صاحب سے اس کی شکایت کر رہے تھے کہ وہ گاڑی سے اتر کر مسجد کے اندر چلا آیا۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ امام صاحب اور باقی سب کو سلام کیا۔

امام صاحب نے اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر اس سے سوال کیا کہ وہ کون ہے اور مسجد میں کیا کر رہا ہے۔ خدا نے جواب دیا کہ وہ خدا ہے۔ آسمان سے آیا ہے اور ان سب کے ساتھ مسجد میں ایک دن گزارنا چاہتا ہے۔

امام صاحب نے مشکوک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دیکھا اور پھر پوچھا کہ وہ سچ بتائے کہ وہ کون ہے اور وہاں کیا کر رہا ہے۔ اس نے پھر اپنا جواب دہرایا کہ وہ خدا ہے، آسمان سے آیا ہے، اور ان کے ساتھ ایک دن مسجد میں گزارنا چاہتا ہے۔

امام صاحب نے اس کا جواب سنا تو انہوں نے نمازیوں سے کہا کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے اور مسجد میں ان کی جاسوسی کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی نمازیوں نے مار مار کر خدا کا بھر کس نکال دیا۔ وہ گرتا پڑتا مسجد سے بھاگا۔ سارے نمازی گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرتے اس کے پیچھے بھاگے۔

کسی نے یہ ہنگامہ دیکھا تو پولیس کو کال کر دی۔ سارے شہر کے پولیس والے گاڑیاں بھگاتے، ہوٹر بجاتے، مسجد کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے مار مار کر خدا کا برا حال کر دیا ہے۔

پولیس والوں کی گاڑیاں دیکھتے ہی خدا تیزی سے بھاگ کر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں جہاں مجرموں کو بٹھایا جاتا ہے بیٹھ گیا۔ پولیس والے نے یہ سوچ کر گاڑی بھگا دی کہ خدا خود اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا ہے اب وہ اسے پولیس اسٹیشن لے جائے گا اور وہاں جا کر تفتیش کرے گا اور پوری کوشش کرے گا کہ خدا کی اصلیت جان سکے۔

پولیس والا برق رفتاری سے گاڑی دوڑا کر پولیس اسٹیشن پہنچا اور جاتے ہی اپنی گاڑی اسٹیشن کے باہر روک کر خوشی سے چیف کو آواز دی کہ وہ اس مجرم کو پکڑ لایا ہے جو خود کو خدا کہتا ہے اور جس کی وجہ سے سارا شہر صبح سے بخار میں مبتلا ہے۔

پولیس والے کا جوش و خروش دیکھ کر اس کا چیف بھی خوشی سے بھاگتا ہوا آیا تاکہ اس مجرم کو گرفتار کر سکے۔ پولیس آفیسر اور چیف نے مل کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر صرف خون آلود کپڑے پڑے تھے اور خدا زمین پر ایک دن بسر کر کے واپس آسمانوں کی طرف جا چکا تھا۔

سگرٹ کی بو

اس رات دوکان بند کر کے سلیمی صاحب گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ بیگم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے آج میر صاحب اپنے بیٹے کے لیے سدرہ کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ لڑکا اچھا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ کھاتا کماتا ہے۔ میں نے ہاں کر دی ہے۔

لیکن آپ نے ہاں کرنے سے پہلے سدرہ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔ سدرہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کیا اپنے بابا کے پسند کردہ لڑکے سے شادی سے انکار کرے گی۔

انہوں نے بہت اعتماد کے ساتھ بیگم کو جواب دیا۔ ابھی سلیمی صاحب اور ان کی بیگم یہ بات کر ہی رہے تھے کہ سدرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سلیمی صاحب نے پیار سے بیٹی کو چمکارتے ہوئے اپنے پاس بلایا اور کہا:

"سدی بیٹی آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میر صاحب آئے تھے۔ اپنے بیٹے حماد کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہے تھے۔ میں نے ہاں کر دی ہے۔"

"ابو یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ میں حماد سے شادی نہیں کروں گی۔"

بیٹی کے منہ سے حرف انکار سنتے ہی سلیمی صاحب بھڑک اٹھے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ سدی اس طرح اس رشتے سے صاف انکار کر دے گی۔ پھر بھی ضبط دکھاتے ہوئے انہوں نے کہا:

"سدی تم اپنے بابا کے سامنے کہہ رہی ہو کہ تم ان کے پسند کئے ہوئے لڑکے سے شادی نہیں کرو گی۔"

"ہاں بابا، میں حماد سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس بار سدی کے انکار پر سلیمی صاحب واقعتاً آپے سے باہر ہو گئے۔ "دیکھو سدی میں سیدھے سبھاو تم سے کہتا ہوں کہ میں میر صاحب کو زبان دے چکا ہوں۔ اب تمہیں ہر حال میں ان کے بیٹے سے شادی کرنا ہو گی ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔؟ سدرہ نے باپ کے روبرو آتے ہوئے کہا۔

"ورنہ۔۔" یہ کہہ کر انہوں نے سدی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ والے کمرے کے اندر دھکیلا اور باہر کنڈی لگا کر تالہ لگا دیا۔

"ورنہ تم اس وقت تک یہاں قید رہو گی جب تک تم میر صاحب کے بیٹے سے شادی کے لیئے ہاں نہیں کر دیتی۔ اور تب تک تمہارا کھانا پینا سب بند۔ اگر تمہاری ماں، بہن یا بھائی نے تمہیں کھانا دینے کی کوشش کی تو ان کو بھی تمہارے ساتھ اس کمرے میں بند کر دوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے تالے کی چابی جیب میں ڈالی اور پاؤں پٹختے، بغیر کچھ کھائے پیئے، باہر چلے گئے۔

اب بیٹی کمرے کے اندر قید تھی اور باہر اس کی ماں، بہن اور بھائی رو رہے تھے اور اس سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ حماد سے شادی کر لے۔ حماد اچھا لڑکا ہے۔ شکل وصورت کا اچھا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اچھے پیسے کماتا ہے۔ اور میر صاحب کی شہر میں ایک عزت ہے۔ سب لوگ ان کو جانتے ہیں۔ اور دل سے ان کا احترام کرتے ہیں۔ اگر وہ ہاں کر دے گی تو اس کے ابا کا غصہ کم ہو جائے گا۔ اور وہ تالہ کھول دیں گے۔ اور یہ مصیبت ٹل جاے گی۔

لیکن سدی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ وہ بھی کمرے کے اندر دروازے کے پیچھے کھڑی رو رہی تھی لیکن یہی کہے جا رہی تھی کہ وہ مر جائے گی لیکن حماد سے شادی نہیں کرے گی۔

سلیمی صاحب بیٹی کو کمرے میں بند کر کے گھر سے چلے تو آئے تھے اور انہیں بیٹی کے میر صاحب کے بیٹے سے شادی سے انکار پر غصہ بھی آ رہا تھا لیکن ساتھ ہی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے پر ان کے دل میں مسلسل ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے جس محبت کے ساتھ اپنی دونوں بیٹیوں اور ایک بیٹے کو پالا تھا ان کے جاننے والوں میں اس کی مثال دی جاتی تھی۔

شاید ہی کبھی بچوں کی کوئی خواہش ہو گی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو۔ خاص طور پر سدی ان کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اس سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔

زندگی میں یہ پہلی بار تھا کہ انہوں نے اس کو ناراضگی سے کمرے میں اس طرح بند کیا تھا اور تالہ لگا کر گھر سے چلے آئے تھے۔

عام طور پر وہ بعد از شام گھر سے نکلتے تھے تو اپنے دوست ملک صاحب کے ریستورانٹ پر جا کر بیٹھ جاتے، جہاں ان کے دوسرے دوست بھی آ جاتے اور اس وقت تک وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہتے اور گھر نہ جاتے جب تک ملک صاحب ڈنر سے فارغ ہو کر رستورانٹ بند نہیں کر دیتے تھے۔

لیکن یہ پہلی بار تھی کہ ان کے قدم رستورانٹ کی طرف اٹھنے کی بجائے شہر کے وسط میں واقع نہر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کسی سے ملیں یا بات کریں۔

ان کے سر میں سارا وقت میر صاحب کی ان کی دوکان پر آمد سے لے کر، ان کی بیٹی کا عاجزانہ اور محبت بھرے انداز میں اپنے بیٹے کے لیے ہاتھ مانگنا، ان کے بیٹے حماد کا چہرہ، اور پھر گھر میں ہونے والی اپنی بیگم اور بیٹی سے گفتگو اور بیٹی کا حماد سے شادی کرنے کا صاف انکار اور پھر اسے کمرے میں بند کر کے تالا لگانا ایک ٹیپ کی طرح چل رہا تھا۔ وہ افسوس کے ساتھ سوچ رہے تھے اور مسلسل سوچے چلے جا رہے تھے کہ آخر سدرہ نے حماد سے شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔ انہیں اس بات پر اور بھی تعجب تھا کہ آخر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے سزا کے طور پر کمرے میں بند ہو جانا قبول کر لیا تھا لیکن اس سے شادی کی حامی نہیں بھری تھی۔

انہوں نے سوچا شاید اسے کوئی اور لڑکا پسند ہو جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہو اور اس نے انہیں کسی وجہ سے اعتماد میں نہ لیا ہو۔ لیکن انہیں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں تھا کہ کبھی ان کی بیگم نے ان کے ساتھ ایسی کوئی بات کی ہو جس میں سدرہ کے کسی لڑکے کو پسند کرنے کا حوالہ ہو۔

وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے نہر کی طرف چل رہے تھے۔ ان کو سدرہ کی پیدائش سے لیکر اس روز انکار تک اس کی زندگی کے سب واقعات یاد آ رہے تھے۔

انہیں یاد آیا کہ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو کتنی دیر تک وہ اسے اپنے بازوں میں تھام کر اس کے ننھے منے ہاتھوں اور پیروں کو محبت سے چومتے رہے تھے۔

وہ جب بھی شام کو دوکان سے واپس لوٹتے تو وہ ہمک کر ان کے بازوں میں آ جاتی اور وہ دیر تک اسے اٹھائے اُس کے ساتھ محبت سے کھیلتے اور باتیں کرتے رہتے۔

اور پھر جب وہ اور ان کی بیگم پہلے دن اسے سکول چھوڑنے گئے تھے تو کس طرح بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گھر لوٹے تھے۔ تب ان کی بیگم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی تو اسے سکول چھوڑا ہے کسی دن ان کو اس کا ہاتھ کسی اجنبی کے ہاتھ میں تھمانا ہو گا تب وہ کیا کریں گے۔

سلیمی صاحب ان خیالات میں کھوئے تھے اور ادھر گھر میں سدرہ کا کمرے کے اندر اور اس کی ماں اور بہن اور بھائی کا کمرے سے باہر رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔

سدرہ کا بھائی شکیل ماں سے روتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ امی بابا بہت برے ہیں۔ انہوں نے دیدی کو کمرے میں بند کر دیا ہے اور رولایا ہے۔ میں کبھی ان سے بات نہیں کروں گا۔

بہن طاہرہ جو کہ سدرہ سے کئی سال چھوٹی تھی روتے ہوئے ماں سے کہہ رہی تھی کہ ماں دیدی کو باہر نکالو ورنہ وہ اندر ہی بھوک اور پیاس سے مر جائے گی۔

شکیل اور طاہرہ کی باتوں سے سدرہ اوراس کی ماں کے جذبات اور بھی بے قابو ہو رہے تھے۔

ماں اب بھی سدرہ سے کہہ رہی تھی کہ وہ فی الحال بابا سے ہاں کر دے وہ بعد میں انہیں سمجھا بجھا کر ان کو اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے کہے گی۔ لیکن اس کے جواب میں سدرہ نے ایک ناں پکڑ رکھی تھی اور مسلسل روتے ہوئے کہے جا رہی تھی کہ میں مر جاؤں گی لیکن حماد سے شادی نہیں کروں گی۔

اسکول چھوڑنے والے دن کا واقعہ یاد کر کے سلیمی صاحب کی آنکھیں پھر آنسوں سے نم ہو گئیں اور وہ چلتے چلتے سسکیاں بھرنے لگے۔ سدی جان میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ زندگی میں ایک ایسا دن بھی آئے گا کہ مجھے تمہارے ساتھ یہ سلوک کرنا پڑے۔ کاش میری زندگی میں یہ دن کبھی نہ آتا۔ کاش تم

حماد کے ساتھ شادی کرنے سے اس طرح انکار نہ کرتی۔ کاش میں تمہارے ساتھ اس وقت تمہاری شادی کی بات نہ کرتا تو شاید یہاں تک نوبت نہ آتی کہ مجھے تمہیں اس طرح کمرے میں بند کر کے تالا لگانا پڑتا۔ جیسے جیسے شاید کی گھنٹی کی آواز ان کے ذہن میں تیز ہو رہی تھی ان کی آنکھوں کی نمی برکھا میں بدل گئی۔ مون سون کے بادل کی طرح روتے روتے ان کے قدم نہر کی طرف جانے کی بجائے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

اسی حال میں وہ گھر پہنچے اور اپنے ہاتھوں سے تالا کھول کر بیٹی کو گلے سے لگایا تو بیٹی بھی رونا شروع ہو گئی۔ پھر روتے روتے بولی: بابا حماد مجھے بھی پسند ہے۔ میں بھی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میری اس سے بات بھی ہوئی تھی۔ لیکن۔۔۔۔

بولو بولو بیٹی لیکن کیا؟ ماں نے بے قراری سے پوچھا۔ بتاؤ ناں دیدی لیکن کیا؟ طاہرہ اور بھائی نے سدرہ سے لپٹتے ہوئے کہا:

"لیکن یہ کہ وہ سگریٹ پیتا ہے اور مجھے سگرٹوں کی بو سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اسے کہا تھا وہ سگریٹ پینا چھوڑ دے لیکن وہ کہتا ہے وہ مر جائے گا لیکن سگریٹ پینا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے میں بھی مر جاؤں گی لیکن اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

"اچھا یہ بات ہے"، سلیمی صاحب نے بیٹی کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا، "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں کل ہی میر صاحب سے کہہ دوں گا کہ وہ حماد کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھ لیں سدرہ کی شادی ان کے بیٹے سے نہیں ہو سکتی۔

"بابا آپ نے مجھے بتانے کا موقع ہی کب دیا تھا۔" سدرہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

دہشت گرد

پر ہجوم جگہ پر بم پھٹا تو کئی لوگوں کے پرخچے اڑ گئے۔ آسمان پر اڑتے چیلوں اور کووں نے بم سے فضا میں بکھرتے انسانی وجودوں کے کچھ چیتھڑے زمین پر گرنے سے پہلے دبوچ اور پھر سامنے بنی اونچی عمارتوں کی ممٹیوں پر بیٹھ کر ضیافت اڑائی۔ ان کے طور اطوار دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی دہشت گردوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

رحمت علی ایک ان پڑھ آدمی تھا۔ نماز روزے اور دینی فرائض سے مکمل طور پر نابلد اور دنیاداری میں عام پاکستانیوں جیسا۔ سیدھا سادہ، بھولا بھالا کام سے کام رکھنے والا انسان۔

جب سے شہر میں بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی کوشش ہوتی کہ وہ کسی بھی ایسی جگہ کھڑا نہ ہو جہاں لوگوں کا ہجوم ہو۔ اسے اندازہ تھا کہ دہشت گرد ایسی ہی پر ہجوم جگہوں پر کاروائیاں کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہلاک کر سکیں۔ وہ کیوں اس طرح اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو ہلاک کر رہے تھے اس کا رحمت علی کو کوئی اندازہ نہیں تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ امریکہ کا صدر کون ہے۔ نہ اسے یہ پتہ تھا کہ اسرائیل فلسطینیوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ نہ اسے اندازہ تھا کہ افغانستان میں پوری دنیا سے آئے نیٹو کے فوجی ان افغانوں کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں جو اس سے پہلے دو سپر پاوروں کو عبرت ناک شکست دے چکے ہیں اور اب تیسری سپر پاور کی فاتحہ خوانی کی تیاری کر رہے ہیں۔

جب سے شہر میں دہشت گردی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس کا معمول تھا وہ صبح مزدوری کے لیے گھر سے نکلنے سے پہلے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر پورے شہر کی فضا کا جائزہ لیتا۔ اس کی بیوی اور بچے اسے پوچھتے کہ وہ کام پر جانے سے پہلے چھت پر کھڑا ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتا ہے تو وہ سادگی سے جواب دیتا کہ وہ دیکھتا ہے کہ آج شہر کے کس حصے میں چیلیں اور کوے پرواز کر رہے ہیں۔ پھر کہتا کہ پولیس والوں کو

دہشت گردوں کی کاروائیوں کا پیشگی پتہ نہیں چلتا لیکن آسمان پر اُڑتے چیل اور کوے جانتے ہیں کہ آج شہر کے کس علاقے میں انہیں انسانوں کا گرما گرم گوشت کھانے کو ملے گا۔ چناچہ وہ صبح ہی صبح اس علاقے میں پرواز شروع کر دیتے ہیں۔ اور جیسے ہی بم پھٹتا ہے یا خود کش حملہ آور کاروائی کرتا ہے وہ فوراً آسمان کی بلندی سے زمین کی طرف غوطہ لگاتے ہیں اور جس کی چونچ میں جو آتا ہے جھپٹ کر کسی عمارت کی ممٹی پر جا بیٹھتا ہے اور پھر مزے لیکر انسانی گوشت کھاتا ہے۔

پھر وہ کہتا کہ شہر کے جس حصے میں اسے چیلیں اور کوے پرواز کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ ادھر کا رخ کرنے کی بجائے مزدوری کی تلاش میں شہر کے دوسرے حصوں کی طرف نکل جاتا ہے۔

وہ کہتا ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ ابھی وہ جوان ہے اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا۔ ابھی وہ اپنی جوان بیوی، اپنے چھوٹے سے بیٹے اور ننھی منی سی بیٹی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔

اس کا تیرہ سالہ بیٹا اور دس سالہ بیٹی اس کی یہ بات سن کر ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتے۔

"بابو کووں اور چیلوں کو کیا پتہ کہ دہشت گرد شہر کے کس حصے میں حملہ کرنے جا رہے ہیں؟"

وہ پیار سے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھالیتا اور کہتا:

"پگلی جانور انسانوں سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ وہ قبل از وقت اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ان کو خوراک کہاں ملے گی۔ چنانچہ وہ پہلے سے اس جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

ایک دن صبح ہی صبح سوکھی روٹی بن چینی چائے کے کپ کے ساتھ کھا کر حسب معمول وہ گھر کی چھت پر گیا تا کہ آسمان پر اڑتے چیلوں اور کووں کی پرواز دیکھ کر اندازہ لگائے کہ آج دہشت گرد کس علاقے میں کاروائی کریں گے۔

اسے یہ دیکھ کر پریشانی ہوئی کہ اس روز چیلیں اور کوے اس کے اپنے علاقے میں پرواز کر رہے ہیں۔

وہ چھت سے نیچے اترا اور مزدوری کے لیے گھر سے باہر جانے سے پہلے اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ آج نہ وہ خود گھر سے باہر جائے اور نہ بچوں کو جانے دے۔ بلکہ ہو سکے تو آج گھر کا دروازہ تک نہ کھولے مبادہ کوئی دہشت گرد کہیں آس پاس بم نہ چھوڑے یا خود کو دھماکے سے نہ اڑائے۔

یہ کہہ کر وہ گھر سے نکلا تو تھوڑی دور ایک پان والے کی دوکان پر رکھے چھوٹے سے ٹی وی سیٹ سے نشر ہونے والی خبریں سننے کے لیے رک گیا۔

ٹی وی پر خبریں سنانے والی خاتون کہہ رہی تھیں: "حکومت کو خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ چند دہشت گرد شہر میں داخل ہو چکے ہیں چنانچہ تمام شہری اپنے ارد گرد لوگوں پر نظر رکھیں اور اگر انہیں کسی جگہ کوئی مشکوک آدمی دکھائی دے تو اس کی اطلاع فوراً پولیس کو دیں۔"

یہ خبر سن کر وہ آگے بڑھا تو تھوڑے فاصلے پر ایک چوک میں اسے ایک ٹریفک پولیس والا ٹریفک کنٹرول کرتا دکھائی دیا۔

رحمت علی چند لمحوں کے لیے رک گیا تا کہ پولیس والے کو اپنے خدشات سے آگاہ کرے کہ آج بم دھماکہ اس علاقے میں ہو گا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ پولیس والے کو کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اس نے سوچا اس کے بچے اس کا چیلوں اور کووں کا مفروضہ سن کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں بھلا پولیس والا اس کی بات کہاں سنے گا۔ بلکہ الٹا کہیں یہ نہ ہو کہ وہ اسے پکڑ کر دہشت گردوں کا ساتھی ہونے کے الزام میں تھانے لے جائے۔

چنانچہ وہ پولیس والے کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے مزدوری کے اڈوں کی طرف چلا گیا۔

وہ ایک کے بعد مزدوری کے دوسرے اور پھر تیسرے اڈے پر گیا لیکن خلاف معمول آج اسے کوئی کام نہ ملا۔ ویسے بھی صبح اپنے علاقے میں چیل اور کوے اڑتے دیکھ کر آج وہ کچھ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔

وہ ایک فیملی مین تھا اور محنت مشقت پر ایک سچے محنت کش کی طرح ایمان رکھتا تھا۔ مزدوری نہ ملنے پر وہ کوئی نہ کوئی ایسا دھندہ ڈھونڈھ لیتا جو اس کے معمول کے کاموں سے ہٹ کر ہوتا۔ اس سے اگر اسے چند

روپے مل جاتے تو وہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا اور اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر گھر لوٹتا۔

اس دن روز مرّہ کی مزدوری نہ ملنے پر اس نے کوئی اور دھندہ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔

وہ مزدوری کے روز مرّہ اڈوں سے سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوا تا کہ آج کا دن عافیت سے اپنے بچوں کے ساتھ گزارے۔

خالی ہاتھ گھر واپس جاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ آج کا دن خیریت سے گزر جائے اور کہیں خون خرابہ نہ ہو۔

انہی خیالات میں گم وہ اس چوک کے پاس پہنچا جہاں صبح ٹریفک پولیس والا آتی جاتی ٹریفک کنڑول کر رہا تھا۔

اس نے دیکھا ٹریفک پولیس والے نے ایک سفید رنگ کی گاڑی روک رکھی تھی اور اس کے ڈرائیور سے کاغذات مانگ رہا تھا۔ پھر شاید پولیس والے کو کوئی شک ہوا تھا کہ اس نے گاڑی والے کو گاڑی سے نیچے اترنے اور گاڑی کی تلاشی دینے کے لیے کہا۔

رحمت علی نے دیکھا چیلیں اور کوے عین اس وقت آسمان پر بہت نیچی پرواز کر رہے تھے۔

چیلوں اور کووں کو اتنی نیچی پرواز کرتے دیکھ کر اس نے وہاں سے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے دیکھا عین اس لمحے وہ گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ اڑ گئی جس سے گاڑی والا، پولیس والا اور ارد گرد کھڑے دسیوں لوگوں کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے۔

چیلوں اور کووں نے حسب معمول جھپٹ کر ہوا میں اڑتے انسانی گوشت کے ٹکڑے پکڑے اور آس پاس کی عمارتوں کی ممٹیوں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا اور اپنے بیٹے اور بیٹی کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

فری لانس رپورٹر

روائتی طور پر کہانی یوں بنتی ہے کہ ایک تنہا لڑکی ایک دن سر شام ایک ویران گلی میں جا رہی تھی۔ دو بھوکے جنسی درندوں نے اسے گلی میں جاتے دیکھا تو انہوں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔

جب لڑکی نے دیکھا کہ دو درندے اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو اس نے گلی میں بھاگنا شروع کر دیا تا کہ وہ جلد سے جلد اپنے گھر کی حدود کے اندر داخل ہو جائے اور خود کو ان درندوں سے بچالے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر تک پہنچ پاتی ان درندوں نے لڑکی کو پکڑ لیا اور اس کے کپڑے تار تار کر دیئے۔

ان میں سے ایک ریوالور پکڑ کر کھڑا رہا جب کہ دوسرے نے اسے اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا۔ پھر دوسرا ریوالور پکڑ کر کھڑا رہا اور پہلے نے اپنی جنسی بھوک مٹائی۔

اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ کوئی ایک ہیرو اچانک کہیں سے نمودار ہوتا اور اس سے پہلے کہ دونوں جنسی درندے لڑکی کو جنسی ہوس کا نشانہ بناتے وہ ان پر حملہ آور ہو کر ان کی پٹائی کرتا اور انہیں اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔

لیکن اس کہانی میں ایسا کچھ نہ ہوا۔ لڑکی کی سر محلہ عزت لٹتی رہی، وہ مدد، مدد پکارتی رہی لیکن نہ کوئی کھڑکی کھلی نہ دروازہ۔ دونوں ولن یکے بعد دیگرے اس کی عزت لوٹتے رہے، وہ چیختی چلاتی رہی لیکن کہیں سے کوئی ہیرو نمودار نہ ہوا۔

اب روائتی کہانی میں اگر ہیرو نمودار ہوتا اور ان دو درندوں کو مار بھگاتا تو اس کے بعد وہ لڑکی کو اگر وہ شہری ہیرو ہوتا تو اپنے کوٹ سے اور اگر دیہاتی ہیرو ہوتا تو اپنی چادر سے ڈھانپ کر اس کے گھر لے جاتا۔ پھر وہ لڑکی لڑکھڑاتی زبان اور لرزتے جسم کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرتی اور جانے سے پہلے شہری ہونے کی صورت میں چائے اور دیہاتی ہونے کی صورت میں لسی کا گلاس پینے کی دعوت دیتی جسے وہ خوشی سے قبول کرتا۔

اگر یہ فلمی کہانی ہوتی تو ایسے میں فلم میں لڑکے کے دل میں لڈو پھوٹتے دکھائے جاتے۔ لیکن یہ چونکہ فلمی کہانی بھی نہیں تھی اس لیے ایسا کچھ نہ ہوا۔ نہ لڈو پھوٹے نہ پھلجھڑیاں پھوٹیں۔

اس حقیقی کہانی میں دو وحشی درندوں نے لڑکی کے ساتھ زبردستی جنسی زیادتی کی اور اس کے بعد اندھا دھند گولیاں برساتے محلے سے چلے گئے۔ جاتے جاتے ایک دو گولیاں لڑکی کی رانوں پر بھی مارتے گئے تا کہ رانوں پر گولی سے بننے والے نشانوں کی وجہ سے اس کے ذہن اور اس کی روح پر لگنے والے زخم ہمیشہ تازہ رہیں۔

یہ کہانی دنیا کے کسی بھی ملک میں رونما ہو سکتی تھی۔ لیکن جس کہانی کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ مملکت خداداد کشورالمومنین اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رونما ہوئی۔

وحشی درندے چونکہ گولیاں برساتے ہوئے فرار ہوئے تھے اس لیے سارا وقت اس محلے میں کوئی شخص، مرد یا عورت، اپنے گھر سے باہر نہ آیا۔ سب اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے رہے مبادہ وہ گن بردار غنڈے ابھی محلے ہی میں موجود ہوں اور دو چار گولیاں ان کے سینے میں بھی اتار دیں۔

اب اگر حقیقی زندگی میں یہ کہانی رونما ہوتی تو محلے والے برستی گولیوں کی پرواکئے بغیر اس مظلوم لڑکی کی مدد کرتے۔ اسے اٹھا کر ہسپتال لے جاتے۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر کے اسے سکون آور دوائیں دیتے، پولیس کو بلا کر میڈیکل رپورٹ پولیس کے حوالے کرتے اور انہیں ہدایت کرتے کہ ملزموں کے خلاف مقدمہ درج کر کے انہیں گرفتار کرے اور جج کے سامنے پیش کرے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

وہ مظلوم لڑکی کافی دیر تک نیم بے ہوشی کی حالت میں اسی سنسان محلے میں پڑی رہی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے جسم میں سے اتنا خون بہہ چکا تھا کہ ایک آدھ بار اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن غش کھا کر وہیں گر پڑی۔ پھر بے ہوشی کچھ کم ہوئی تو اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کی وجہ سے چاہنے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھ سکی۔

کسی روائتی کہانی کے ہیرو کے برعکس ایک نوجوان لڑکا جس کا نام اجمل تھا، کندھے پر کیمرہ لٹکائے، کسی کام سے اس محلے میں آنکلا۔ اجمل ایک فری لانس رپورٹر تھا۔

وہ سارا دن شہر کی سڑکوں پر مارامارا پھرتا۔ اگر کہیں کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ دکھائی دیتا وہ فلم بنا کر چھوٹی سی زبانی رپورٹ بناتا اور شہر میں چلنے والے ٹی وی چینلوں کو کال کرکے اسے چند سکوں کے عوض بیچ دیتا۔ کئی ٹی وی چینلوں نے اس کا کام دیکھتے ہوئے اسے مستقل ملازمت کی آفر دی لیکن اس نے ہر ایسی آفر یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ ایسا کرنے سے اس کی کام کرنے کی آزادی ختم ہو جائے گی۔

ایک روائتی ہیرو کے برعکس اس نے اس لڑکی کو اس ویران سنسان محلے میں اس طرح دیکھا تو اس کی مدد کرنے کی بجائے پہلے اس نے اس لڑکی اور اس کے محل وقوع کی فلم بنائی۔ پھر اس نے اس لڑکی کے ساتھ مملکت خداداد کشورالمومنین کے ایک بڑے شہر کے ایک سنسان محلے میں ہونے والے واقعہ اور محلے والوں کی بے حسی پر مبنی رپورٹ بنائی۔

اسے رپورٹ میں ایک بڑی خبر کا پوٹینشیل نظر آیا تو اس نے سب سے پہلے ملک کے سب سے بڑے ٹی وی چینل سے مواصلاتی رابطہ قائم کیا۔

ٹی وی چینل نے اس سے وہ خبر فوراً کئی ہزار روپوں میں خریدلی۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے کئی ہزار زیادہ دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کسی اور رپورٹر کو بے ہوش لڑکی تک نہ پہنچنے دے تاکہ ان کے چینل کو یہ خبر سب سے پہلے نشر کرنے کا اعزاز حاصل رہے۔

اب اگر یہ ایک روائتی کہانی ہوتی تو رپورٹر فلم بنانے اور رپورٹ بنانے سے پہلے کسی ایمرجنسی ادارے کو کال کرکے اس کو ہسپتال بھجوانے کا اہتمام کرتا۔ لیکن ٹی وی چینل والوں سے زائد رقم ملنے کے وعدے پر اس نے پوری کوشش کی کہ ایسی کوئی چیز نہ ہونے پائے۔

ٹی وی چینل کے نیوز ایڈیٹر نے اجمل کی رپورٹ اور فلم چلانے سے پہلے حکومتی بے حسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وزیر اعظم کو برا بھلا کہا۔ اس بہیمانہ واقعہ کو بنیاد بنا کر ان کے وزیروں کی عزت دری کی۔ اور اس کے بعد ٹی وی خبروں میں بریکنگ نیوز کے طور پر اس بد قسمت لڑکی کی خبر نشر کی۔

وزیر اعظم اس وقت اپنے چند وزیروں کے ساتھ لیٹ ڈنر کر رہے تھے۔ صدر صاحب بھی بغیر اعلانیہ طور پر ڈنر میں شریک ہونے کے لیئے چلے آئے تھے۔ دراصل ڈنر میں تاخیر وزیر اعظم کو یہ کہہ کر کروائی گئی تھی کہ وہ غیر اعلانیہ طور پر ڈنر میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم کے علاوہ اور چند وزیروں کو بھی صدر صاحب کی ڈنر میں غیر اعلانیہ شرکت کی اطلاع تھی لیکن وہ بھی وزیر اعظم کی طرح مہر بلب تھے۔ مرغ کی ٹانگیں ان سب کے ہاتھوں میں تھیں جنہیں وہ مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

ملک کے سب سے بڑے ٹی وی چینل نے اجمل کی رپورٹ نشر کی تو صدر، وزیر اعظم، اور وزیروں نے لیٹ ڈنر ٹیبل پر بیٹھے نیوز ایڈیٹر کے کمنٹس کے ساتھ وہ خبر سنی۔

کہانی کی غیر روائتی نوعیت کو سمجھتے ہوئے صدر اور وزیر اعظم نے اپنے اپنے سیکرٹریوں سے کہا کہ وہ ان کی طرف سے لڑکی اگر کنواری ہو تو اس کے والدین کو دو دو لاکھ روپے اور اگر شادی شدہ ہو تو اس کے خاوند کو انصاف دلانے کی یقین دہانی کا اعلان اسی ٹی وی چینل سے کروا دیں۔

روائتی کہانی کے برعکس شہر کے آئی جی پولیس نے صدر اور وزیر اعظم کا دو دو لاکھ روپے لڑکی کے والدین کو دینے کا اعلان سنا تو انہوں نے شہر کے تھانوں سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ انہیں پتہ چلا کہ شہر کے کسی تھانے میں ایسے کسی واقعہ کے بارے میں کوئی رپورٹ درج نہیں کی گئی تھی۔

پولیس تھانوں میں ایسی کوئی رپورٹ درج نہ ہونے کی وجہ سے آئی جی نے ٹی وی چینل پر کال کی تاکہ جائے وقوع کا پتہ چلا سکیں۔ ٹی وی کی طرف سے ملنے والی انفارمیشن کے بعد آئی جی صاحب اپنے عملے کے ساتھ رات دیر گئے خود اس گلی میں پہنچے تو رپورٹر وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

لڑکی اب بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں گلی میں پڑی تھی۔ انہوں نے وائرلیس پر ایمبولینس کال کی تاکہ لڑکی کو ہسپتال پہنچاسکیں۔ لیکن جب تک ایمبولینس آئی لڑکی زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے فوت ہوچکی تھی۔

ایمبولینس نے لڑکی کی لاش مردہ خانے پہنچادی۔

اجمل نے اسی ٹی وی پر لڑکی کے فوت ہونے کی خبر سنی تو سوچنے لگا کہ کاش وہ فری لانس رپورٹر کی بجائے ایک روائتی کہانی کا ہیرو ہوتا تو شاید اس لڑکی کی زندگی بچ جاتی۔

انقلاب

مریم کا بطور استاد کلاس میں پہلا دن تھا۔ ہیڈ مسٹریس نے مریم کو بچوں سے متعارف کروایا اور پھر کلاس روم سے چلی گئی۔ مریم نے تختہ سیاہ پر بڑے حروف میں لکھا ان ق ل اب اور پھر بچوں سے کہنے لگی کہ وہ سارے یکے بعد دیگرے ایک ایک حرف پڑھیں۔ مریم کے کہنے کے مطابق پہلا بچہ کھڑا ہوا اس نے کہا الف، پھر دوسرا کھڑا ہوا اس نے پڑھا نون، پھر تیسرا کھڑا ہوا اس نے کہا قاف، چوتھے نے کہا لام، پانچویں نے کہا الف اور چھٹے نے با آواز بلند کہا بے۔

پھر مریم نے اگلے بچوں سے پہلے بچوں کی پیروی کرتے ہوے اسی طرح الف، نون، قاف، لام، الف اور بے دہرانے کے لیے کہا۔ ان بچوں نے بھی اس طرح سارے حروف دہرائے۔

جب کلاس کے سب بچے بہ ترتیب الف، نون، قاف، لام، الف، اور بے دہرا چکے تو مریم نے بچوں سے پوچھا کہ ان میں سے کون ان حروف کو لفظ کی شکل میں ادا کر سکتا ہے۔ مریم کے سوال پر کلاس میں موجود جواب دینے کے لیے کئی بچوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔

مریم نے ایک بچے کو جو باقی بچوں سے تھوڑا زیادہ قد آور تھا کہا کہ پہلے وہ لفظ ان حروف سے بننے والا لفظ ادا کرے گا اور پھر باقی سب بچے اس کی پیروی کرتے ہوے بیک آواز یہ لفظ ادا کریں گے۔

جمیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور پھر استاد سے کہنے لگا کہ اسے معلوم ہے کہ پوری کلاس میں اس کا قد سب سے بلند ہے لیکن پھر بھی وہ چاہتا ہے کہ وہ یہ لفظ کرسی پر کھڑا ہو کر بلند آواز میں کہے۔

مریم نے جمیل سے پوچھا وہ یہ لفظ کرسی پر کھڑا ہو کر کیوں ادا کرنا چاہتا ہے۔ جمیل نے جواب دیا کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا سارے بچے اس لفظ کی تکرار صحیح طور پر کر پاتے ہیں یا نہیں۔

مریم نے کہا کہ اس کا کرسی پر کھڑا ہونا اچھا آئیڈیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ یہ جاننے کے لیے کرسی پر کھڑا ہو کہ سب بچے یہ لفظ کہہ پاتے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ بچے یہ لفظ ادا نہ کر پائیں۔ اگر کچھ بچے

یہ لفظ ادا نہ کر پائیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یہ لفظ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے وہ صرف اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور یہ لفظ ادا کرے تو بھی چلے گا۔

جمیل نے اپنی نئی استاد مریم کی بات سنی تو کہنے لگا وہ صرف یہ لفظ اسی وقت ادا کرے گا اگر اسے کرسی پر کھڑا ہو کر یہ لفظ ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔

مریم نے جمیل سے کہا کہ وہ نہیں چاہتی کہ وہ کرسی پر کھڑا ہو۔ اسے سب بچوں کے ساتھ فلور پر کھڑا رہتے ہوئے یہ لفظ کہنا چاہیے اور پھر بھول جانا چاہیے کہ کون یہ لفظ کہہ پاتا ہے یا نہیں۔

اگر ایک بار کچھ بچے یہ لفظ ادا نہیں کریں گے یا ادا نہیں کر پائیں گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر ایک بار وہ ایسا نہ کر پائیں تو اس سے جمیل کو یا کسی اور بچے کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس لفظ کی تکرار جاری رکھنی چاہیے۔ اس طرح جو بچے ایک بار یہ لفظ ادا نہیں کر سکیں گے وہ دوسری بار باقی بچوں کے ساتھ اپنی آواز شامل کر لیں گے۔

اتنی گفتگو کے بعد مریم نے جمیل سے کہا کہ وہ فی الحال اپنی جگہ پر بیٹھ جائے۔ پھر بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی کہ وہ اسی طرح کچھ اور حروف تختہ سیاہ پر تحریر کرے گی۔ تمام بچے پہلے کی طرح ان حروف کی ادائیگی کریں گے تو وہ انہیں فارسی ادبیات میں سے ایک خوبصورت کہانی سنائے گی۔ یہ کہہ کر مریم نے تختہ سیاہ پر ان ق ل اب کے اوپر لکھاپ رواز۔

پہلے کی طرح ایک ایک کر کے سب بچوں نے ان حروف کو دہرایا۔ جب وہ سب یہ حروف دہرا چکے تو مریم نے بچوں کو مندرجہ ذیل کہانی سنائی۔ اس نے کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"ایک بار کسی درخت پر کئی کبوتر رہتے تھے۔ وہ دن چڑھے درخت سے اڑتے سارا دن ادھر ادھر دانہ دنکا چگتے اور رات کو واپس درخت پر لوٹ آتے۔ وہ سب اپنی زندگی سے بہت خوش تھے۔ اگرچہ انہیں خوراک ڈھونڈنے کے لیے بعض اوقات دور تک اڑنا پڑتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ سب خوش تھے کیوں کہ انہیں کھانے کے لیے دانہ، پینے کے لیے پانی اور رات بسر کرنے کے لیے درخت کی مہرباں شاخیں

اور پتے میسر تھے۔ درخت کی شاخیں اور پتے نہ صرف انہیں شب بسری کے لیے ٹھکانا فراہم کرتے تھے بلکہ گرمی اور سردی کی سختیوں سے بھی بچاتے تھے۔

ایک بار ایک چالاک شکاری نے اتنے سارے کبوتر ایک درخت پر دیکھے تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان سب کو پکڑے گا اور کچھ کو اپنی خوراک بنائے گا اور کچھ کو بیچے گا۔

یہ سوچ کر اس نے ایک رات درخت کے پاس ایک جگہ کچھ دانے بکھیرے اور دانوں کے پاس جال کچھ اس طرح لگایا کہ جیسے ہی کبوتر درخت سے اتر کر دانہ کھانے لگیں سب جال میں پھنس جائیں۔

اگلی صبح دانوں کے لیے اڑان بھرنے سے پہلے کبوتروں نے درخت کے پاس دانے بکھرے دیکھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

پھر ایک دوسرے سے بولے کہ آج وہ دانے دنکے کے لیے زیادہ دور تک اڑنے کی بجائے یہیں زیرِ درخت بکھرا دانہ چنیں گے اور باقی دن مہرباں درخت کی شاخوں پر آرام کریں گے۔

ان میں سے کچھ ایک نے کہا کہ پہلے ایسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہم ہمیشہ دانوں کے لیے اس درخت سے اڑ کر دور دراز کھیتوں میں جاتے رہے ہیں۔ آج اگر رات کی تاریکی میں کوئی یہاں دانے پھینک گیا ہے تو ضرور اس میں کسی نہ کسی طرح کی چالاکی چھپی ہے۔

لیکن جو ان میں زیادہ حریص تھے فوراً درخت سے نیچے اترے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دانہ کھا سکیں۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی سب نے بھی اڑان بھری اور درخت کے قریب بکھرے دانوں پر جھپٹ پڑے۔ جیسے ہی وہ سب دانے چگنا شروع ہوئے شکاری کا لگایا جال گرا اور وہ سب اس میں پھنس گئے۔

جال میں پھنسنے کے بعد سب کبوتر دانہ چگنا بھول گئے اور پریشانی کے عالم میں غٹر غوں غٹر غوں رونے لگے"۔

اتنی کہانی سنا کر مریم نے کلاس میں بیٹھے بچوں کے چہروں کی طرف دیکھا تو اسے سب کے سب اداس اور غمزدہ دکھائی دیئے وہ کبوتروں کی حماقت اور زبوں حالی پر پریشان تھے۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ

ان کے خیال میں اب بچارے کبوتر اس شکاری کی بھوک کا شکار ہو جائیں گے یا کسی اور کی بھوک مٹانے کے کام آئیں گے۔

بچوں کو یوں غمزدہ اور اداس دیکھ کر مریم نے بچوں سے پوچھا کہ ان کے خیال میں شکاری کے جال میں پھنسے کبوتروں کا اب کیا بنے گا اور اس خطرناک صورت حال سے دوچار کبوتروں کو رہائی پانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

کلاس میں موجود سبھی بچوں نے کبوتروں کی زبوں حالی پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ مریم نے بچوں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا کہ صورت حال چاہے کتنی بھی خراب کیوں نہ ہو اس میں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر مریم نے دوبارہ ان الفاظ میں کہانی کا غاز کیا:

"ان کبوتروں میں جمیل کی طرح ایک اسمارٹ کبوتر تھا اس نے اپنے ساتھیوں کو اس طرح جال میں پھنسے دیکھا تو اس نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ سب اس کی طرف متوجہ رہیں تو وہ ایک دو تین کہے گا۔ جیسے ہی وہ تین کہے وہ سب پوری طاقت کے ساتھ پرواز شروع کر دیں۔

یہ کہہ کر اسمارٹ کبوتر نے ایک دو تین کہا۔ تین کے ساتھ ہی سب کبوتروں نے مل کر اڑان بھری تو ان کی قوت پرواز سے جال اوپر اٹھ گیا۔ جیسے ہی جال اوپر اٹھا سب کبوتر تیزی کے ساتھ جال کے نیچے سے نکل کر ہوا میں پرواز کر گئے"۔

کبوتروں کی جال سے رہائی اور پرواز کی خبر سے کلاس میں موجود تمام بچوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ان کی تالیوں کے شور سے سارا کلاس روم گونج اٹھا۔

پھر وہ سب اچانک اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہوئے اور تالیاں بجانی بند کر کے بیک آواز تختہ سیاہ پر لکھے الفاظ زور زور سے دہرانے لگے۔ پرواز۔ انقلاب۔ پرواز۔ انقلاب۔

مریم بطور استاد اپنا پہلا دن کلاس میں گزار کر جانے کے لیے اٹھی تو سب بچوں کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے پرواز، انقلاب، پرواز، انقلاب کی صدا بلند کرتے ہوئے کلاس روم سے باہر چلی گئی۔

چپہ بھر روٹی

اقبال جسے سب جاننے والے بالا کہتے تھے ایک فٹ بال بنانے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ یہ کام اس نے کئی برس پہلے شروع کیا تھا۔ اس کے باپ نے غربت کے ہاتھوں تنگ آکر اسے اسکول میں پانچویں جماعت سے اٹھا کر اس فٹ بال فیکٹری میں بھرتی کروایا تھا۔ چند برس کی محنت کے بعد بالا اس قابل ہوا کہ بغیر کسی نگرانی کے خود فٹبال سینے لگا۔

ان دنوں پاکستان دنیا کا واحد ملک تھا جہاں بنے فٹبال پوری دنیا میں ایکسپورٹ ہوتے تھے۔ یورپ اور لاطینی امریکہ کے ہر ملک میں فٹبال بہت شوق سے کھیلی اور دیکھی جاتی تھی۔

کبھی کبھار بازار میں سے گزرتے کسی چائے خانے میں رکھے کسی ٹی وی پر بالے کو فٹبال کا میچ دکھائی دیتا تو وہ چند منٹ وہاں رک جاتا۔ جیب میں چند سکے ہوتے تو میچ دیکھنے کے لیے وہ گرما گرم چائے کا ایک کپ خرید کر چند منٹوں کے لیے چائے خانے کے ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور پھر فٹبال پر لکھا برانڈ نیم پڑھنے کی کوشش کرتا۔ اگر کبھی فٹبال پر ولسن لکھا دکھائی دے جاتا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ وہ فخر سے ارد گرد بیٹھے لوگوں کو بتاتا کہ یہ فٹبال اس کی کمپنی میں بنا تھا۔

اسی طرح فٹبال سیتے بالے کی عمر اٹھارہ سال ہوئی تو اس کے ماں باپ نے اپنے ہی گاؤں میں بشیرے موچی کی بیٹی آمو سے اس کی شادی کر دی۔ آمو کا اصل نام آمنہ تھا۔

اس کو آمنہ کا نام گاوں کی مسجد کے مولوی صاحب نے دیا تھا۔ کئی برس قبل جب آمنہ کی پیدائش ہوئی تھی اس کا باپ بشیرا لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا تھا۔

اسے اس بات سے عار آتی تھی کہ اپنے کسی جاننے والے کو اپنے ہاں بیٹی کی پیدائش کے بارے میں بتاتا۔ اپنی بیوی کے حاملہ ہونے سے پہلے اسے لڑکوں کے کئی نام یاد تھے۔ جب اس کی بیوی بشیراں کا حمل سے پیٹ پھولنا شروع ہوا تو اسی وقت اس نے بہت سے لڑکوں کے نام سوچنا شروع کر دیئے۔ لیکن جب آمنہ

کی پیدائش ہوئی اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ اس کے لیے کسی کو یہ بتانا کہ اس کی گھر والی نے لڑکی کو جنم دیا ہے مشکل ترین کام تھا۔ خود اسے نومولودہ کو دینے کے لیے لڑکیوں والا کوئی نام نہیں سوجھتا تھا۔

آمنہ کی پیدائش کے کئی دن بعد ایک دن اتفاقاً مسجد کے امام صاحب اپنی پھٹی جوتی سلانے کے لیے اس کے جوتیاں گانٹھنے کے اڈے پر رکے تو اس نے امام صاحب سے اجرت وصول کرنے کی بجائے انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔ امام صاحب نے پہلے تو اس کے بیٹی کی پیدائش پر احساس شرمندگی پر یہ کہہ کر اس کی سرزنش کی کہ بیٹے اور بیٹیاں دونوں اللہ کی نعمت ہیں۔ پھر انہوں نے اسے لڑکی کا نام آمنہ رکھنے کا مشورہ دیا۔

شاید زندگی میں یہ پہلی اور آخری بار تھا کہ کسی نے اس بچی کو آمنہ کہہ کر پکارا تھا۔

اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے آمو ہو گئی۔ گھر اور محلے والے سب اسے ہمیشہ آمو کہہ کر پکارتے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کا نام آمنہ ہے۔ اگر کوئی اسے پوچھتا کہ اس کا نام کیا ہے تو وہ ہمیشہ پوچھنے والے کو اپنا نام آمو ہی بتاتی۔

بہرحال جب بالے اور آمو کی شادی ہوئی تو دونوں بہت خوش تھے۔ پہلے بالے کے گھر میں تین افراد خانہ تھے جو ایک ہی چھت تلے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا باپ، ماں اور خود بالا۔ بالے کی شادی کے بعد اس گھر میں آمو بھی چلی آئی تو اس چھوٹے سے گھر میں تین کی بجائے چار افراد ہو گئے۔

گھر کیا تھا، بس چند گز زمین پر کچی مٹی سے چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ چار دیواری کے اندر درختوں کی موٹی موٹی سوکھی لکڑیوں اور مٹی سے ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا تھا۔

کمرے میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ تین یا چار چارپایاں بچھائی جا سکتیں۔ اس لیے زمین پر چند پھوڑ اور پھوڑوں پر چٹایاں بچھی رہتیں جنہیں رات میں کھول دیا جاتا اور دن کو لپیٹ کر چلنے پھرنے کے لیے جگہ بنائی جاتی۔ یہ گھر بالے کے دادا نے بنایا تھا۔ بعد میں اس کے ماں باپ کی زندگی بھی اسی گھر میں گزری تھی۔

ہر سال بارشوں کا موسم شروع ہونے سے پہلے اس کا باپ گاوں کے جوہڑ سے مٹی نکال لاتا جسے اس کی ماں چھت اور دیواروں پر لیپ دیتی اور اس طرح وہ گھر ایک سال کے لیے موسم کی سختیوں سے محفوظ ہو جاتا۔

آموسے شادی کے بعد یہ فریضہ بالے اور آمو نے سنبھال لیا۔ اس طرح بالے اور آمو کی زندگی اپنے باپ دادا کی زندگیوں کے سانچے میں ڈھل گئی۔ فرق پڑا تو صرف اتنا کہ پہلے اس کا دادا اور بعد میں اس کا باپ لوگوں کی زمینوں پر مزدوری کرتے جس سے ان کا گزارہ چلتا۔ جبکہ بالے نے اپنے باپ کے کہنے پر کھیت مزدوری کی بجائے فٹبال بنانے کی فیکٹری میں کام شروع کر دیا تھا۔

شروع میں بالے کے دادا نے کوشش کی کہ وہ بالے کے باپ کو اس کے بچپن میں اسکول بھجواتا اور لکھنا پڑھنا سکھاتا لیکن چند ہی سال بعد غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر اسے بالے کے باپ کو اپنے ساتھ کھیتوں پر مزدوری پر لگانا پڑا۔ بعد میں بالے کے باپ نے بھی بالے کو اسکول بھجوا کر یہی کوشش کی لیکن اسے بھی مجبوراً چند سالوں بعد بالے کو اسکول سے اٹھوا کر فٹبال بنانے کی فیکٹری میں ملازمت دلانا پڑی۔

جب بالے نے بچپن میں فٹ بال فیکٹری میں کام شروع کیا اور چند ماہ بعد وہ پہلی بار بگار کے چند روپے گھر لایا تو اس کا باپ بہت خوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بالے کو کھیت مزدوری سے نجات دلا کر اس نے اپنے خاندان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

اس لیے بالے کی شادی کے بعد، چند روز بیمار رہنے کے بعد، وہ فوت ہوا تو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے سے طمانیت کا یہ احساس جھلکتا تھا۔ باپ مرا تو ماں کی طبعیت بھی خراب رہنے لگی۔ وہ بھی جلد ہی ایک وفا شعار بیوی کی طرح سل اور دق سے خون تھوکتے راہی ملک عدم ہوئی۔

ماں باپ کی وفات سے پہلے بالا نہ صرف فٹبال سینے کا مکمل کاریگر بن چکا تھا بلکہ شادی کے بعد وہ اتنے پیسے بھی کمانے لگا تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری اور چار دیواری کے اندر واقع اکلوتا کمرہ بھی پکی

اینٹوں سے بنوالیا تھا۔ چناچہ جب اس کے باپ اور ماں کی وفات ہوئی تو وہ دونوں زمین پر بچھی چٹائی پر مرنے کے بجائے پکی اینٹوں کے کمرے میں بچھی چارپائیوں پر مرے۔

بالے کے ماں باپ کو فوت ہوئے چند برس گزرے تو اس نے گھر میں بجلی لگوائی، کمرے میں آمو کے کہنے پر بجلی کے ایک بلب کے علاوہ بجلی سے چلنے والا ایک پنکھا بھی لگوایا۔

جلد ہی تین پیڑھیوں کو پروان چڑھانے والے اس ایک کمرے کے گھر میں جو پہلے کچی مٹی اور گارے سے بنا تھا اور اب بالے کی فٹبال فیکٹری میں برسوں کی محنت کے بعد پکی اینٹوں سے بنے گھر میں تبدیل ہو چکا تھا بالے اور آمو کے ہاں ایک خوبصورت بیٹے نے جنم لیا۔

بیٹا بالے اور آمو کی جان تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد بالے نے فیکٹری میں مزید دل لگی اور محنت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پہلے کبھی کبھار اگر فیکٹری کا مالک اسے اپنے وقت سے زیادہ ٹائم لگانے کے لیے کہتا تو وہ انکار کر دیتا۔ لیکن بیٹے کی پیدائش کے بعد اس نے فیکٹری کے مالک سے خود درخواست کی کہ وہ جتنا ممکن ہو سکے اوور ٹائم لگانا چاہتا ہے۔

اوور ٹائم کرنے کی وجہ محض اس کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اسکول بھجوائے اور زیور تعلیم سے آراستہ کرے۔

اسے اپنی زندگی کے بارے میں قلق تھا کہ اس کی تعلیم کا سلسلہ پانچویں جماعت سے رک گیا تھا۔ چناچہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح مالی مشکلات اور غربت کی وجہ سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

بالے اور آمو کا بیٹا ابھی ڈھائی تین سال کا تھا کہ ملک میں پہلے سیاسی اور پھر معاشی ابتری پھیلنی شروع ہوئی۔ جس سے پیداواری اور کاروباری عمل سست روی کا شکار ہوا۔

بین الاقوامی منڈیوں میں فٹبالوں کی سپلائی کا خلا پیدا ہوا تو چین اور جاپان نے فٹبال بنا کر پاکستان سے زیادہ سستے داموں ایکسپورٹ کرنا شروع کر دیئے۔

جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ پاکستان میں فٹبال بنانے کی ایک کے بعد دوسری فیکٹری بند ہونا شروع ہوئی۔ پہلے اوور ٹائم ختم ہوا پھر روز مرّہ کا کام بھی کم سے کمتر ہوتا گیا۔

اوپر سے ملک میں بین الاقوامی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر رشوت خوری کی بنیاد پر قائم کیا گیا بجلی کا نظام پورے ملک میں اس طرح درہم برہم ہوا کہ فیکٹریوں کو بجلی کی سپلائی روک دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں مندی پھیل گئی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔

بالے نے فٹبال فیکٹری میں محنت سے جو پیسا کمایا تھا کچھ کچے گھر کو پکا بنانے پر صرف ہوا باقی ملک بھر میں مندی پھیلنے اور چیزوں کی مہنگائی کی وجہ سے تیزی کے ساتھ خرچ ہوا۔ یہاں تک کہ پہلے بالے کے کھانے پینے میں کمی آئی پھر آمو کے اور پھر ان کے لیے اپنے بیٹے کی مناسب خوراک کا بندوبست بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔

چند ماہ تک ادھر ادھر سے مانگ تانگ کر گزارہ چلتا رہا یہاں تک کہ ارد گرد والے اور دوکاندار بھی بالے اور آمو کی شکل سے بے زار ہونے لگے۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دیکھتے تو فوراً بد کلامی اور بد زبانی شروع کر دیتے۔

ایک دن تو آمو اور اس کے چھوٹے سے بیٹے کی دنیا بالکل ہی اجڑ گئی۔

ہوا یوں کہ گھر میں کئی دن سے فاقہ چل رہا تھا۔ بالا اپنی فیکٹری کے مالک کے پاس گیا۔ فیکٹری کئی ماہ سے بند پڑی تھی۔ اس نے فیکٹری کے مالک سے درخواست کی کہ وہ اسے چند روپے ادھار دے اور جب بھی فیکٹری میں کام دوبارہ شروع ہو وہ اس کی پگار میں سے وہ پیسے کاٹ لے۔

لیکن فیکٹری کے مالک نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے اس سے کہا کہ ایک تو اس کی اپنی مالی حالت ابتر ہے اور دوسرے ملک میں سیاسی اور معاشی صورت حال دن بدن مزید بگڑ رہی ہے اور اب اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ ان کی فیکٹری دوبارہ چلے گی۔ چنانچہ اس کے لیے اسے پیسے ادھار دینا ممکن نہیں۔

بالا فیکٹری کے مالک سے مایوس لوٹا تو آمو بھوک سے بلکتے بچے کے ساتھ ہمسائیگی میں لوگوں کے دروازوں پر دستک دینے چلی گئی کہ شاید کوئی اس پر ترس کھا کر ان کی مدد کر دے۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ گھر لوٹی تو بالے نے گلے میں پھندا اڈال کر بجلی کے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔

آمو نے بالے کی بجلی کے پھنکے سے لٹکتی لاش دیکھی تو پہلے تو بے ہوش ہو گئی پھر ہوش میں آئی تو اس نے رو رو کر بینوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

ہمسائیوں نے اس کا رونا دھونا سنا تو پتہ کرنے چلے آئے۔ جب انہوں نے بالے کی لاش پنکھے سے لٹکتی دیکھی تو انہوں اس لاش کو پنکھے سے اتار کر پہلے نہلا دھلا کر اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور پھر آمو اور اس کے بیٹے کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لائے۔ بالے کی موت پر جو کھانے پینے کا سامان آیا تھا دو چار دن میں ختم ہوا۔ اور پھر بھوک کی وہی خوفناک بلائیں آہستہ آہستہ آمو اور اس کے بیٹے کی طرف بڑھنے لگیں۔

بالے کی خودکشی کے بعد آمو کی ساری آسیں اور امیدیں دم توڑ گئیں۔ ایک تو وہ چھوٹے سے بچے کی ماں تھی اس کے ساتھ اس کے لیے کام کاج کرنا ممکن نہیں تھا اور پھر گھر میں کوئی ایسی جمع پونجی نہیں تھی جسے بیچ کر وہ اپنا اور اپنے بیٹے کے پیٹ کا جہنم بھرتی۔

اس کے باوجود اس نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ کوئی ہمسائیگی میں یا ادھر ادھر اسے گھر کے کام کاج کے لیے دو وقت کی روٹی پر ملازم رکھ لے لیکن اس کرموں جلی کی قسمت نے یاوری نہ کی۔

کچھ مخیر حضرات نے خدا ترسی کرتے ہوئے اسے اپنی رکھیل بننے کی دعوت دی لیکن سیدھی سادی نیک دل آمو اپنی بھوک اور مجبوری کے باوجود خود کو اس کام پر آمادہ نہ کر سکی۔

کئی دنوں سے بھوکی آمو ایک دن اپنے بھوک سے بلکتے بیٹے کو گود میں لیے اپنے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر بیٹھی تھی کہ سامنے والے گھر کی دیوار پر اسے چند کوے شور مچاتے دکھائی پڑے۔ ایک

کوے کے منہ میں کوئی چپہ بھر روٹی تھی جو دوسرے کوے اس سے چھیننے کی کوشش کررہے تھے۔ کووں کی اس چھینا جھپٹی میں روٹی کا ٹکڑا گلی میں گرپڑا۔ اس سے پہلے کہ کوے جھپٹ کر وہ ٹکڑا پکڑتے وہ فوراً اٹھی تاکہ کووں سے پہلے وہ روٹی کا ٹکڑا اٹھالے۔

جیسے ہی تیزی کے ساتھ وہ کوے کے منہ سے گلی میں گری چپہ بھر روٹی کی طرف بڑھی ایک طرف سے تیزی سے آتا ایک موٹر سائکل سوار اس سے آٹکرایا۔ تیز رفتار موٹر سائکل کی ٹکر سے آمو روٹی کا ٹکڑا اٹھانے سے پہلے اپنے بیٹے سمیت سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ چند منٹوں بعد آمو اور اس کا بیٹا دونوں اسی جگہ دم توڑ گئے۔

کووں نے گلی میں گری چپہ بھر روٹی اٹھائی اور ہوا میں اڑ گئے۔

حرم

نادیہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھی۔ اس کی پیدائش پاکستان کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی تھی۔ ماں اور باپ پڑھے لکھے تھے، اپنے بیٹوں کی طرح انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی نادیہ کو ڈاکٹری کی تعلیم دلائی تھی تاکہ اسے زندگی میں کسی معاشی محتاجی کا شکار نہ ہونا پڑے۔

نادیہ ڈاکٹر بنی تو اس کے سب گھر والے بہت خوش تھے۔ اس کی کامیابی پر اس کے بابا کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں۔

پاکستان میں جس طرح کے حالات جا رہے تھے، ایک شریف آدمی کا ان حالات میں عزت کے ساتھ زندہ رہنا مشکل تھا۔

عورتیں تو ویسے بھی تہری غلامی کا شکار تھیں۔ خاوند کی غلامی، مذہبی غلامی اور رسم و رواج کی غلامی۔

نادیہ جیسے جیسے اپنی تعلیم کی تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی اس کے اندر ان سب غلامیوں کے خلاف سرکشی کا جذبہ جنم لے رہا تھا۔ وہ آزادی چاہتی تھی خاوند سے، مذھب سے اور رسم و رواج سے۔ اس آزادی کے حصول کے لیے اس کے ذہن میں کئی منصوبے پل رہے تھے۔ اس کی ماں، باپ اور بھائی اس کے ذہن میں پلنے والے طوفانوں سے بے خبر اس کے اچھے مستقبل کے سنہرے سپنے دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنے لیے کسی مناسب لڑکے کا انتخاب کرے گی اور وہ بخوشی اس کی شادی اس کی پسند کے لڑکے کے ساتھ کر کے اسے اس کے گھر سدھاریں گے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے اپنی گریجوایشن تک کسی لڑکے کا اپنی ماں یا بھائیوں سے ذکر نہ کیا۔ کئی بار اس کی ماں بیگم حسن نے اس کی دوستوں سے پوچھا کہ کیا ان کی بیٹی نے اپنے لیے کوئی لڑکا پسند کیا ہے۔

بیگم حسن کے سوال کے جواب میں نادیہ کی سہیلیاں مسکرا اٹھتیں۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ تھا کہ نادیہ کے دل کی گہرائیوں میں کیا طوفان پل رہے تھے لیکن وہ بیگم حسن کو ان طوفانوں کے بارے میں بتا کر ہیجان میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

بیگم حسن اور ڈاکٹر حسن اگرچہ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی اعتدال پسندی اور رواداری پورے شہر میں ضرب المثل تھی لیکن جس طوفان کا سامنا انہیں نادیہ کی گریجوایشن کے چند دنوں بعد کرنا پڑا اس کی توقع انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ نادیہ کی کامیابی پر ان کی آنکھوں سے چھلکنے والے خوشی کے آنسو غم اور دکھ کے ایسے بادل بن جائیں گے کہ ان کے برسنے سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لیے بادوباراں کے طوفان کی نذر ہو جائے گی۔

ہوا یوں کہ ان ہاؤس جاب کی تکمیل کے چند دنوں بعد نادیہ نے اپنے تمام دوستوں کے لیے اپنے گھر پر ایک پارٹی رکھی۔

پارٹی کے دعوتی کارڈ پر اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دوستوں کی کامیابیوں کا جشن منانے کے علاوہ ایک اہم اعلان کرنے جا رہی ہے۔ ساتھ ہی اس نے وارننگ دی تھی کہ وہ اعلان بعض لوگوں کے لیے انتہائی شاک کا سبب بن سکتا ہے اس لیے اگر وہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھ سونگھنے کے لیے امونیا لانا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

نادیہ اپنی خوبصورتی اور نازک اندامی کے لیے اپنے ہر تعلیمی ادارے میں اپنے ہم جماعتوں میں مقبول تھی۔ پرائمری سے لیکر کالج، اور کالج سے لے کر میڈیکل یونیورسٹی تک، اس کے ہم جماعت اسے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

اس کا خوبصورت چہرہ، ہمیشہ مسکراتی آنکھیں، اور چہرے کے ایک طرف لٹکتی چند زلفیں دیکھ کر ہر کوئی محسوس کرتا ایک ماہتاب ہے جو بادلوں کی اوٹ سے نکلا چاہتا ہے۔

نادیہ کو بھی اپنے قاتلانہ حسن کا خوب اندازہ تھا۔ اس احساس کے تحت وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر ایسی اپنائیت اور اعتماد سے ملتی کہ سب سشدر رہ جاتے۔

پارٹی کے کارڈ کی عبارت نے نادیہ اور اس کے خاندان کے ملنے والوں میں خاصی ہل چل پیدا کی۔

سب سوچ وبچار اور بحث و تمحیص میں مصروف تھے کہ آخر نادیہ کیا کہنے جارہی ہے جس کی وجہ سے اس نے لوگوں کو وارننگ دی ہے کہ وہ ایک بہت بڑے شاک کے لیے تیار ہو کر آئیں۔

بیگم اور ڈاکٹر حسن کا خیال تھا کہ وہ پارٹی میں اس خوش نصیب لڑکے کو متعارت کرائے گی جو اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اس کے بھائیوں کا بھی خیال تھا کہ پارٹی میں نادیہ اپنی پسند کے بارے میں وہ راز افشا کرے گی جسے وہ اب تک اپنے سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔

اس کے دوستوں میں زیادہ تر چہ میگویاں بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے خاندان والوں نے اس کے لیے کوئی لڑکا پسند کیا ہے جسے اس پارٹی میں متعارف کرایا جائے گا۔

بہت انتظار کے بعد وہ دن آ پہنچا جب ڈاکٹر حسن کے درمیانے درجے کے گھر کو دلہن کی طرح سجایا گئی۔

گھر کے پچھلے لان میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سارے لان میں بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ نادیہ کی سہیلیوں نے پارٹی کی جگہ کی تزئین و آرائش کچھ اس طرح کی تھی کہ درمیانے درجے کا گھر ایک عالی شان رہائش گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شہر کے بہترین ریستوران سے خوارک منگوا کر نادیہ کی سہیلیوں نے اسے ایسے اسٹالوں کی شکل میں سجایا تھا کہ ہر کوئی چل پھر کر اپنی پسند کی خوراک کھا سکتا تھا۔ انہی سہیلیوں نے ایک طرف گانے بجانے کے لیے بھی جگہ بنا رکھی تھی۔ انہوں نے سگائی کے موقع پر گانے کے لیے چند گانوں کی پریکٹس بھی کر لی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پارٹی کے دوران نادیہ اپنے ہونے والے شریک حیات کے بارے میں اعلان کرے گی تو وہ سگائی کے گانے گا کر اس کی خوشیوں میں شریک ہوں گے۔

شام ہوئی تو رفتہ رفتہ نادیہ اور اس کی فیملی کے جاننے والے پارٹی کے لیئے ان کی رہائش گاہ پر آنا شروع ہوئے۔

گھر کی آرائش اور سجاوٹ دیکھ کر سب یہی کہہ رہے تھے کہ پارٹی کی آڑ میں نادیہ کی منگنی ہونے جا رہی ہے۔

جب کافی مہمان آچکے اور گھر کے پچھلے لان میں کھانے پینے کا سلسلہ چل نکلا تو ڈاکٹر نادیہ دلہن کی طرح سج کر اپنے کمرے سے بر آمد ہوئی۔

اس کی دلہنوں جیسی سجاوٹ دیکھ کر سب کی نظریں اس پر جم گئی۔ سب نے آگے بڑھ کر اس کے حسن کی تعریف کی، اس کی ڈاکٹری کی تعلیم کی تکمیل اور خوبصورت پاڑٹی کے انعقاد پر اسے مبارک باد دی اور انہیں دعوت دینے کا شکریہ ادا کیا۔

ابھی نادیہ اپنے ملنے والوں سے مبارک بادیں وصول کر رہی تھی کہ اس کے چار کلاس فیلو جو اب اس کی طرح ڈاکٹر بن چکے تھے زرق برق اچکنیں پہنے، دولھوں جیس راجستانی پگڑیاں سر پر سجاے، پارٹی میں آ پہنچے۔

بیگم اور ڈاکٹر حسن بھی آنے والوں کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

انہوں نے چار نوجوانوں کو دلہوں کے لباس میں ملبوس گھر کے لان میں آتے دیکھا تو کسی متوقع خطرے سے ان کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ چار نوجوانوں کی دلہوں کے لباس میں ملبوس آمد سے کوئی مفہوم اخذ کرتے نادیہ نے آگے بڑھ کر ان چاروں نوجوانوں کا استقبال کیا۔

پھر ان چاروں کے درمیان کھڑے ہو کر پارٹی میں شامل لوگوں کو مخاطب کرتے ہوے بولی:

"سب سے پہلے میں آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ میری دعوت پر آپ اس پارٹی میں تشریف لائے۔

میں اپنے پاپا، ماما، بھائیوں اور سہیلیوں کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس پارٹی کے انعقاد میں ہر طرح سے میری مدد کی۔ اگر وہ سب اس پارٹی کے انعقاد میں میری مدد نہ کرتے تو شاید میرے لیے اس پارٹی کا اہتمام ممکن نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ میں خاص طور پر ممنون ہوں اپنے پاپا اور ماما کی جنہوں نے مجھے جنم دیا۔ محبت سے میری پرورش کی۔ میری ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھا۔ مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی جس کے نتیجے میں آج میں صرف نادیہ نہیں بلکہ ڈاکٹر نادیہ ہوں۔

اس کے بعد وہ انکشاف جس کے بارے میں میں نے اپنے دعوتی کارڈ میں وارننگ دی تھی۔

میں آج آپ سب کی موجودگی میں یہ اعلان کرنا چاہتی ہوں کہ میں نے ان چاروں نوجوانوں سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سب بھی بیک وقت مجھ سے شادی کرنے اور میرے حرم کا حصہ بننے کے لیے تیار ہیں۔۔۔۔"

ابھی ڈاکٹر نادیہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہاں موجود سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ سب کے ہاتھوں میں پکڑی کھانے کی پلیٹیں زمین پر گر گئیں۔ بیگم اور ڈاکٹر حسن شرم کے مارے فوراً گھر کے اندر چلے گئے اور دھاڑیں مار کر رونا دھونا شروع ہو گئے۔ بیگم حسن روتے روتے بے ہوش ہو گئیں جبکہ ڈاکٹر حسن دیوار سے سر ٹکراتے اور رو رو کر کہتے رہے: "نادیہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ ہماری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ تم نے ہمیں یوں سرعام رسوا کیا"۔

ڈاکٹر نادیہ کا بڑا بھائی جو ابھی تک سراسیمگی کے عالم میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اچانک بجلی کی تیزی کے ساتھ گھر کے اندر گیا اور پھر گولیوں سے بھری گن لا کر اس نے نادیہ اور ان چاروں نوجوانوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔

وہاں موجود مہمانوں نے آگے بڑھ کر نادیہ کے بھائی کو پکڑا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا:

"یہ مردوں کا سماج ہے۔

یہاں صرف مرد چار عورتیں رکھ سکتا ہے۔

کوئی عورت چار مرد نہیں رکھ سکتی۔

چاہے وہ میری بہن نادیہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام صرف مرد کو حرم بنانے کی اجازت دیتا ہے۔

کوئی عورت حرم نہیں بنا سکتی۔"

تھوڑی دیر میں پولیس آئی اور پہلے انہوں نے نادیہ کے بھائی کو لوگوں سے چھڑا کر اپنی گاڑی میں ڈالا۔

اب وہ چیخنے کے ساتھ ساتھ پاگلوں کی طرح قہقہے بھی لگا رہا تھا:

"وہ بھول گئی تھی۔

یہ مردوں کا سماج ہے۔

یہاں صرف مرد

عورتوں کا حرم بنا سکتا ہے۔

کوئی عورت

مردوں کا حرم نہیں بنا سکتی"۔

پولیس کی گاڑی رخصت ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور نادیہ نادیہ پکار رہا تھا۔

عشق مجنوں و لیلیٰ

راوی حکایت بیان کرتے ہیں کے قیس عامری کی عمر اس وقت بارہ سال تھی جب وہ ایک دن مدرسہ جاتے ہوے راستے میں ملنے والی تیرہ سالہ لیلیٰ کو دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوا اور اسے دل دے بیٹھا۔

جب دیکھا تیرا روئے زیبا مدرسے میں
ختم ہوئی دلچسپی حساب و ہندسے میں

راوی بیان کرتے ہیں کہ جب تک قیس عامری کی عمر اٹھارہ سال نہ ہوئی وہ لیلیٰ کی محبت میں جلتا رہا یہاں تک کہ جونپور کے مدرسے سے لیلیٰ کے فارغ التحصیل ہونے کا وقت آ پہنچا۔
اس وقت قیس عامری اپنے آپ میں نہ رہا اور اس کے لیے لیلیٰ کی محبت کو دوستوں سے چھپانا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ ایک دن اس نے مدرسے میں دور سے جب لیلیٰ کا چہرہ دیکھا تو وہ لرزا دینے والے بخار کے مریض کی طرح بہوش ہو گیا۔ دوست دوڑے دوڑے اس کے پاس پہنچے اور سمجھے کے اسے زکام کا زبردست دورہ پڑا ہے جس کی وجہ سے وہ بہوش ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ قیس عامری دل میں ان کی سادہ دلی پر ہنسا اور کہا:

میں نہیں از راہ نزلہ لرزاں دوستو
عشق لیلیٰ میں ہوں گریاں دوستو

اس کے بعد ہر دن قیس عامری پر لیلیٰ کی محبت کا جنوں بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس جنون میں اس نے شہر کو خیر باد کہا اور جنگل و بیاباں کی راہ لی۔ سوائے جنگلی بیر بوٹیوں کے سب کچھ کھانا پینا چھوٹا۔ لباس سے تن آزاد ہوا اور لیلی کی محبت میں نالہ و زاری اس کے روز و شب کا مشغلہ ٹھہرا۔

اگر کوئی بھولا بھٹکا آکر اس سے اس کا نام ونشان پوچھتا تو کہتا کہ نام میرا مجنوں ہے، بیر بوٹیاں میری غذا ہیں اور یہ بیاباں میرا گھر ہے۔

عشق لیلیٰ نے کیۓ جسم وجاں پاک
بیر بوٹیاں ہیں فقط میری خوراک

مجنوں کی ماں نے ایک دن ایک مہرباں جاننے والے کو مجنوں کی تلاش میں بھجوایا تا کہ وہ اسے واپس لائے اور دوبارہ عالم انسانی کا حصہ بنائے۔

جب وہ مہرباں شخص جنگل میں مجنوں کے پاس پہنچا تو اس نے انگشت بدنداں مجنوں کو دیکھا اور اس سے پوچھا یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

مجنوں نے اسے جواب دیا اے عاشقوں کی دنیا کے احوال سے بے خبر تو کیا جانے کہ عاشق کو معشوق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کس حال سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تو میرے حال پر تعجب نہ کر بس یوں سمجھ کہ جو تیرے لیئے سیدھا ہے وہ میرے لیے الٹا ہے اور جو میرے لیئے الٹا ہے وہ تیرے لیے سیدھا ہے۔

اس جہاں کو سیم وزر سے ہے استغنا
عاشق کے لیے کافی ہے جنگل کی ہوا

لیلیٰ سے قیس کے چچازاد بھائی نے جا کر کہا قیس تیرے جمال کی تاب نہ لا کر مجنوں ہو چکا ہے اور اب جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ لیلیٰ نے ہنس کر جواب دیا میں نے کئی بار اس سے کہا ہے کے وہ دل سے میرا خیال نکال دے کیونکہ میری شادی میرے عم زاد ابن سلام کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ اگرچہ میں نے ابن سلام کو بہت بار کہا ہے کے میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن میرے لیے میرے ماں باپ کے انتخاب کا احترام لازم ہے۔ اس لیے میری شادی اسی سے ہو گی۔ لہذا قیس مجھے بھول جائے۔

اگر وہ نہ مانے تو اسے موبائل فون دینا اور کہنا آج رات میری کال کا انتظار کرے میں خود اسے کال کرکے سمجھاؤں کہ جنگل و بیاباں کو چھوڑ کر شہر واپس لوٹے اور دوبارہ زندگی کے رنگ ڈھنگ اپنائے۔

پوچھتے ہیں کیوں مجنوں دیوانہ ہوا
کس کی خاطر سوئے جنگل روانہ ہوا

لیلیٰ سے موبائل فون لے کر قیس کا چچازاد بھائی بیاباں کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ بیاباں پہنچا تو دیکھا قیس جانوروں کی طرح درخت پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اس نے مجنوں سے پوچھا کیوں مجنوں بنے درخت پر چڑھے بیٹھے ہو۔ مجنوں نے کہا ابھی لیلیٰ کے عشق میں یہی بن پایا ہوں۔ اس لیے اس حال میں ہوں۔ شاید لیلیٰ کا عشق ایک دن مجھے پرندہ بنادے اور میں اس کے عشق میں آسمانوں کی طرف پرواز کر جاؤں۔

عشق لیلیٰ سے ہے میرا جسم سوئے روح رواں
سر سوئے افلاک ہے اور دل بنا ہے آتش فشاں

اس کے چچازاد نے موبائل درخت کے پاس رکھا اور یہ کہہ کر وہاں سے روانہ ہوا کہ آج رات لیلیٰ تجھے کال کرے گی۔ اس کی کال کا انتظار کرنا۔ مجنوں دیر تک درخت سے موبائل فون کو محبت بھری دیوانگی سے دیکھتا رہا اور لیلیٰ کی یاد میں روتا رہا۔ آخر درخت سے نیچے اترا۔ فون پکڑ کو اسے چومتا رہا۔ شام گئے فون کی گھنٹی بجی تو اس پر ایک عجیب دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ فون کا جواب دینے کی بجائے اسے بغل میں دبائے چیتے کی طرح جنگل میں دوڑنے لگا۔ اور یوں اس نے وہ موبائل فون گم کر دیا۔

اس حال میں ایک سال بیت گیا۔ لیلیٰ کی شادی ابن سلام سے ہو گئی۔ لیکن رات کے وقت جب ابن سلام دلہا بنا لیلیٰ کے کمرے میں پہنچا تو لیلیٰ نے بغل میں رکھے ڈنڈے سے ابن سلام کے دانت توڑ دیئے اور ضربوں سے اس کا سر پھوڑ دیا۔

کچھ عرصہ بعد مجنوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا:

توڑ دیئے تونے اس چور کے دانت بے خیال

کیسے ناز دکھائے تونے اے پری روجمال

لیلیٰ ابن سلام کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ اس نے جوں توں اس کے ساتھ چند سال گزارے۔ لیکن چند سالوں بعد ابن سلام کو جاں لیوا انزلے کا مرض لاحق ہوا جس سے اس نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ بعد میں لیلیٰ نے مجنوں کو پیغام بھیجا کہ اس کی جان ابن سلام سے چھوٹ گئی۔ اب یا تو وہ شہر واپس آجائے یا وہ اس کے پیچھے جنگل آرہی ہے۔ مجنوں تک جب لیلیٰ کا پیغام پہنچا تو وہ زارو قطار روتا رہا اور کہتا رہا۔

تیرے فراق میں میں اس حال میں ہوں

زندہ ہوں اور بس تیرے خیال میں ہوں

تیرے آلام و فراق سے ہے سینہ چھلنی

اس درد سے ہمیشہ تیرے وصال میں ہوں

اس کیفیت میں وہ جنگل ہی میں رہا اور شہر کی طرف نہیں گیا۔ چند دنوں بعد لیلیٰ اسے ڈھونڈتے ہوئی جنگل پہنچی۔ جب مجنوں نے لیلیٰ کو دیکھا تو فرطِ شوق سے بے ہوش ہوا۔ اسے اٹھا کر شہر میں لیلیٰ کے گھر لائے۔

کئی دنوں بعد ہوش میں آیا۔ لیلیٰ کو اپنے پاس پاکر سوچا وہ مر چکا ہے۔ اور جنت میں لیلیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ لیلیٰ کا قرب پاکر مجنوں آبدیدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔

تیرے جمال نے اس لیے مجھے مارا

کہ آؤں جنت میں اور تجھے دیکھوں

لیلیٰ مجنوں کی بات سن کر ہنسی اور سرزنش سے بولی۔ اتنے سال دیوانوں کی طرح جنگلوں میں گھومتے رہے۔ ماں باپ جدائی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آؤ اب ہم اپنا گھر بنائیں اور باقی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزاریں۔

راوی کہتا ہے چند دنوں بعد مجنوں نارمل ہو گیا۔ لیلیٰ کا باپ ابھی زندہ تھا اس نے ان کی شادی کے جشن کا اہتمام کیا۔ جنگل کے تمام جانور ہرن خرگوش چیتے شیر ہاتھی جو سالہا سال جنگل میں رہنے کے سبب مجنوں سے شناسا ہو گئے تھے اس کی لیلیٰ کے ساتھ شادی کا جشن منانے چلے آئے۔

راوی کہتا ہے شادی کے بعد مجنوں اور لیلیٰ کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے۔ جو ان کے سامنے جوان ہوئے۔ مجنوں ہمہ وقت لیلیٰ کے ساتھ رہا۔ کبھی اس سے جدا نہ ہوا۔ لیلیٰ کے باپ کے باغات سے ان کی زندگی چلتی رہی۔

راوی لیلیٰ اور مجنوں کی ساری داستاں جانتا ہے سوائے اس کے کہ ان کی موت کس سال واقع ہوئی اور وہ کس شہر میں دفن ہوئے۔

بہروز مہمان / ترجمہ کے اشرف

نگاہ خانم

نگاہ خانم کا معمول تھا کہ وہ روزانہ اپنے گھر سے نکل کر پیدل چل کر کالج جاتی۔ اور کالج میں روز مرہ کے معمولات سرانجام دینے کے بعد گھر واپس آجاتی۔

اسے کالج آتے جاتے کئی سال ہو گئے تھے لیکن اس نے کبھی راہ میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں دیکھی تھی۔ کبھی کبھی نگاہ خانم کا جی چاہتا کہ روز مرہ کی یکسانیت ٹوٹے اور کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جس سے اسے کچھ مختلف محسوس ہو۔

لیکن گھر سے کالج کے راستے پر چھائی یکسانیت نگاہ خانم کی زندگی کا حصہ بنتی چلی جارہی تھی۔

چاہنے کے باوجود نگاہ خانم کی زندگی میں کوئی ایسا واقع رونما نہیں ہو رہا تھا جس سے اسے اپنی زندگی میں تبدیلی کا احساس ہوتا۔

وہ محسوس کرتی ان دنوں شہر کے لڑکے بھی کچھ ضرورت سے زیادہ شریف ہو گئے ہیں۔ کسی زمانے میں آتی جاتی لڑکیوں پر لائن مارنا، جملے کسنا، اور ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرنا زندگی کا معمول تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتے۔ اگر کبھی بات آگے بڑھ جاتی تو ارد گرد کا معاشرہ فوراً اپنا کردار ادا کر کے چیزوں کو دوبارہ ڈھرے پر ڈال دیتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

لیکن زندگی میں ایسی یکسانیت بالکل نہیں تھی۔ ایسی لاتعلقی کہ لڑکے لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ بند کر دیں نگاہ خانم کے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔

اس نے یکسانیت سے اکتا کر کالج آنے جانے کے مختلف راستے ڈھونڈے تاکہ روزانہ نئے راستے سے کالج آئے جائے اور اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم کچھ نئے چہروں کے عکس اپنے ذہن پر منقش کرے۔

لیکن کچھ ہی دنوں میں نئے راستے بھی پرانے ہو جاتے اور نئے دکھنے والے چہروں کی جاذبیت بھی تقریباً ختم ہو جاتی۔

نئے راستوں کی تلاش میں ایک دن نگاہ خانم کی زندگی میں ایسا واقعہ رونما ہوا کہ وہ اپنے روائتی راستے کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو گئی۔ اب وہ دوبارہ پرانے راستے سے کالج آنے جانے لگی لیکن اب جس چیز کو اس کی نگاہیں ڈھونڈتی تھیں وہ کہیں نہیں دکھتی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن وہ ایک نئے راستے سے کالج جا رہی تھی کہ اچانک اسے اپنی طرف ایک نوجوان بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

نگاہ خانم جیسے جیسے کالج کی طرف بڑھتی جا رہی تھی وہ نوجوان اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی تو اس کے تعاقب میں نوجوان کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگتے۔ وہ آہستہ روی اختیار کرتی تو نوجوان کی رفتار میں بھی آہستگی آجاتی۔

وہ نوجوان مسلسل نگاہ خانم کے پیچھے چل رہا تھا لیکن اس کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ نہ فاصلے میں کمی آنے دیتا اور نہ فاصلہ بڑھنے دیتا۔

نگاہ خانم جانتی تھی کہ وہ اس کا تعاقب کر رہا ہے لیکن وہ یہ جاننے سے قاصر تھی کہ نوجوان کی رفتار اس کی رفتار کی کمی و بیشی کے ساتھ کیوں کم و بیش ہو رہی تھی۔

نگاہ خانم نے جتنی بار اپنی رفتار سست کی اس کے پیچھے ایک ہی مقصد تھا کہ وہ نوجوان اس تک پہنچے اور جو بھی کہنا چاہتا ہے کہے۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ نوجوان اس سے بات کرے۔ اس پر کوئی جملہ کسے۔ یا کوئی ایسی حرکت کرے جس سے اس کی زندگی کی یکسانیت ٹوٹے۔ لیکن نگاہ خانم کی بار بار کی کوشش کے باوجود نوجوان نے نہ اس کا تعاقب ترک کیا نہ اس سے اپنے فاصلے میں کمی بیشی پیدا ہونے دی۔

اس نوجوان کے ہاتھ میں ایک پیکیج تھا جو وہ نگاہ خانم کو دینا چاہتا تھا لیکن اس کے خیال میں ابھی تک راستے میں کوئی ایسا مقام نہیں آیا تھا جہاں وہ اس پیکیج کو نگاہ خانم کے حوالے کرتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے وہ پیکیج نگاہ خانم کو دیتے ہوئے دیکھے۔

اسے اس بات کا مکمل احساس تھا کہ پاکستان جیسے قدامت پسند معاشرے میں عورت کی آبرو کتنی نازک چیز سمجھی جاتی ہے۔ اور کس طرح اسے آئینے کی طرح ہر وقت صاف رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس رجعت پسند معاشرے میں آئینے پر ذرا سا غبار پڑنے سے عورت کی زندگی اس طرح دھندلا جاتی ہے کہ پھر اسے دنیا کی کوئی چیز صاف نہیں کر سکتی۔

لیکن نگاہ خانم کا اتنا تعاقب کرنے کے بعد بھی ابھی تک نوجوان کو کوئی ایسا موقع نہیں ملا تھا جب کوئی ارد گرد موجود نہ ہو یا اسے دیکھ نہ رہا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ آج وہ کسی طرح پیکیج نگاہ خانم کے حوالے کرے تا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسی راستے سے آیا جایا کرے جہاں سے وہ کئی سالوں سے آ جا رہی تھی۔

وہ نوجوان جانتا تھا کہ پہلے نگاہ خانم کالج میں پڑھنے جاتی تھی اور اب اسی کالج میں پڑھا رہی تھی اور اسی سلسلے میں اس کا روزانہ ادھر سے گزرنا معمول تھا۔

شروع شروع میں جب نگاہ خانم نے روزانہ کی یکسانیت سے تنگ آ کر راستہ تبدیل کرنے کی عادت اپنائی تھی اس نوجوان کا خیال تھا کہ شاید اس کی طبعیت ٹھیک نہیں اور اس نے کالج سے چھٹی کر لی ہے لیکن جب وہ کبھی کبھار پرانے راستے پر آ نکلتی اور پھر کئی دنوں تک غائب ہو جاتی تو نوجوان کو اس کے بارے میں فکر ہونے لگتی۔

نگاہ خانم کے روز روز کے راستوں کی ادل بدل سے نوجوان نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اگر وہ اسے کہیں نظر آئی تو وہ ضرور اس سے ملاقات کر کے اس سے دل کی بات کہے گا۔ اسے بتائے گا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے اور کتنے سالوں سے اس کو آتے جاتے دیکھتا رہتا ہے۔

وہ ایک مصور تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ روزانہ اس کے گھر کے سامنے سے گزرنے والی نگاہ خانم نے اسے مصور بنا دیا تھا تو بے جا نہیں ہو گا۔

وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ یہ گھر کئی سال پہلے اس کے ایک دور کے عزیز نے اس وقت اسے رہائش کے لیے دیا تھا جب اس کے والدین ایک ایکسیڈینٹ میں فوت ہو گئے تھے۔ اور اب وہ اس دنیا میں تنہا تھا۔

گھر شہر کی مین روڈ پر واقع تھا۔ روڈ پر ہر وقت لوگوں کی آمد ورفت رہتی تھی۔ کبھی کبھار پولیس والے بھی گشت کرتے ادھر آنکلتے۔ گھر ایک کمرے پر مشتمل تھا جس کی ایک کھڑکی باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی۔

وہ ہمیشہ نگاہ خانم کے کالج جانے کے وقت کھڑکی میں کھڑے ہو جاتا اور پھر اسے اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتا۔ وہ جب تک اسے دکھائی دیتی وہ وہیں کھڑا رہتا۔ جب وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی وہ پنسل اور کاغذ پکڑ کر اس کی تصویر بنانے لگتا۔

شروع شروع میں اس کی بنائی تصویریں چند دھبوں پر مشتمل ہوتیں لیکن رفتہ رفتہ ان دھبوں میں خدو خال ابھرنے لگے۔

پھر اس نے نگاہ خانم کی تصویر بنانے کے لیے باقاعدہ رنگ استعمال کرنے شروع کئے۔ رنگوں کے استعمال سے اس کی بنائی ہوئی تصویریں شاہکاروں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئیں۔

وہ ہر صبح نگاہ خانم کو جس طرح کے کپڑوں میں جس انداز سے چلتے دیکھتا سارا دن اسے برش اور رنگوں کی مدد سے کاغذ پر اتارنے میں صرف کر دیتا۔ اس کی انگلیاں تب تک برش سے کاغذ پر رنگ بکھیرتی رہتیں جب تک وہ مطمئن نہ ہو جاتا کہ نگاہ خانم کا اس دن کا انداز واقعتاً کاغذ پر منعکس ہو چکا ہے۔

جب سے نگاہ خانم نے یکسانیت سے اکتا کر مختلف راستوں سے کالج آنا جانا شروع کیا تھا اس دن سے اس کی تصویریں بنانے کی روٹین ٹوٹ چکی تھی جس کی وجہ سے وہ خاصی الجھن کا شکار تھا اور اب چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح نگاہ خانم کو مائل کرے کہ وہ پرانے راستے سے کالج آیا جایا کرے تاکہ اس کا تصویریں بنانے کا سلسلہ چلتا رہے۔

لیکن اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اس تک اپنا پیغام کیسے پہنچائے۔ اسی ارادے سے آج صبح وہ گھر سے نکلا تھا کہ کسی نہ کسی طرح نگاہ خانم تک اپنے دل کی بات پہنچا کر رہے گا۔

اسی مقصد سے نگاہ خانم کو دیکھتے ہی وہ اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ لیکن روڈ پر آتے جاتے لوگوں کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل رہا تھا کہ وہ اس سے دل کی بات کہے۔

آخر چلتے چلتے جب نگاہ خانم تقریباً اپنے کالج کے قریب پہنچی اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کو پیکٹ تھمانے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے اسے سائیکل پر سوار ایک پولیس مین دکھائی دیا جو علاقے کا گشت کر رہا تھا۔ پولیس مین کو دیکھتے ہی پیکٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ جلدی سے ہجوم میں گم ہو گیا۔

نگاہ خانم نے پیکٹ گرتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اس پیکٹ کو زمین سے اٹھا لیا کہ ہو سکے تو وہ اسے اس تک پہنچا دے گی۔

لیکن جب نگاہ خانم نے زمین سے پیکٹ اٹھایا وہ حیران ہوئی کہ اس پیکٹ پر اس کا نام اور اس کے کالج کا پتہ لکھا تھا۔

نگاہ خانم نے پیکٹ کھولا تو اس میں اس کی ہاتھ سے بنی ہوئی بہت سی تصویریں تھیں۔ سب سے اوپر والی تصویر میں وہ ادھ کھلی آنکھوں سے کسی طرف دیکھ رہی تھی۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا: وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے۔ نگاہ خانم دیر تک وہیں کھڑی اس تصویر کو دیکھتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ شاید وہ نوجوان واپس آئے۔ لیکن جب وہ واپس نہیں آیا تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ بار بار گنگنا رہی تھی: وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے۔ نگاہ خانم کو محسوس ہوا اس کی زندگی پر کئی سالوں سے چھائی یکسانیت آخر کار ٹوٹنے لگی ہے۔ لیکن راستہ وہی ہے جس پر وہ کئی سالوں سے کالج آ جا رہی ہے۔

پاگل

گاؤں میں سب کا ماننا تھا کہ فقیرا پاگل ہے۔ لیکن فقیرا جانتا تھا کہ وہ پاگل نہیں صرف وقت سے پہلے اس دنیا میں چلا آیا ہے۔ لوگ اس کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں اس لیے وہ اس کو پاگل جانتے ہیں۔

فقیرے کا اصل نام فقیر حسین تھا۔ وہ ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کئی برس قبل جب اس نے میٹرک کیا تو اس کے والد نے گاؤں کے چوہدری صاحب سے کہہ کر اسے محکمہ انہار میں کلرک بھرتی کرا دیا۔ وہ کلرک بھرتی ہو کر بہت خوش تھا۔ ملازمت سے اسے سو ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ مل جاتی تھی جسے لا کر وہ ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ ماں پہلے روپوؤں کو آنکھوں سے لگاتی پھر فقیرے کو خرچ کے لیے دس روپے دے کر باقی اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیتی۔

فقیرے کے پاگل ہونے کی باتیں سب سے پہلے اس کے محکمہ میں اس وقت شروع ہوئیں جب اس نے دفتر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ رشوت کے پیسوں میں سے اپنا حصہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہوا یوں کہ مہینے کے اختتام پر جب اوورسیر صاحب نے مختلف زمین داروں کی طرف سے ملنے والے رشوت کے روپوں میں سے فقیرے کا حصہ اسے دینے کی کوشش کی تو اس نے یہ کہہ کر حصہ وصول کرنے سے انکار کر دیا کہ اسے کام کی تنخواہ ملتی ہے اور وہ تنخواہ کے علاوہ کوئی اور پیسے قبول نہیں کرے گا۔

شروع شروع میں اوورسیر صاحب کا خیال تھا کہ وہ محکمے میں نیا آنے کی وجہ سے رشوت لینے سے انکاری ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ باقی ملازموں کی طرح وہ بھی ان چیزوں کا عادی ہو جائے گا اور اپنا حصہ وصول کر لیا کرے گا۔ لیکن جب کئی ماہ گزرنے کے باوجود اس نے رشوت کے پیسوں میں حصہ دار بننے سے انکار کیا تو اوورسیر صاحب نے اس کے پاگل ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا۔

فقیرے نے اوور سیر صاحب کی بات کا برا منائے بغیر محکمہ انہار میں اپنا کام جاری رکھا۔ وقت کے ساتھ اس نے رشوت میں سے اپنا حصہ نہ لینے کے علاوہ اپنے دفتر کے ساتھیوں کو زمین داروں سے رشوت وصول کرنے پر برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں اس بات پر کوستا کہ انہیں اپنا کام کرنے کی سرکار سے تنخواہ ملتی ہے اس لیے انہیں زمین داروں سے رشوت وصول نہیں کرنی چاہیئے۔ شروع شروع میں اس کے ساتھی اس کے اعتراضات کو کہی ان کہی سمجھ کر باتوں میں اڑا دیتے لیکن جب ان پر اس کی تنقید حد سے بڑھنے لگی تو انہوں نے اوور سیر کے ساتھ مل کر اس کے خلاف رشوت لینے کا کیس بنایا اور اسے ملازمت سے فارغ کرا دیا۔

جس دن اسے رشوت خوری کے الزام میں ملازمت سے نکالا گیا وہ گھر پہنچتے ہی ماں کے سامنے سسکیاں بھر کر رونا شروع ہو گیا۔ ماں نے اسے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو پہلے اسے تسلی دی اور پھر رونے کی وجہ پوچھی۔ اس نے ماں کو بتایا کہ اس کے دفتر کے ساتھیوں نے رشوت کے مال میں حصہ دار نہ بننے کی وجہ سے اس پر رشوت خوری کا الزام لگا کر اسے ملازمت سے فارغ کرا دیا ہے۔

فقیرے کے باپ نے اس کی ملازمت چھوٹنے کی خبر سنی تو بھاگے چوہدری صاحب کے پاس پہنچے تاکہ انہیں کہہ کر اسے ملازمت پر بحال کرائیں۔

چوہدری صاحب کے کہنے پر محکمہ انہار کے افسر نے فقیرے کی ملازمت بحال کر دی لیکن ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ آئندہ اگر وہ رشوت نہ لینا چاہے تو نہ لے لیکن دوسروں سے اس بارے میں کوئی پنگا نہ لے ورنہ وہ دوبارہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

بحالی کا پروانہ پکڑے فقیرا دفتر واپس پہنچا تو اوور سیر صاحب نے اس کو کام کرنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی وارننگ دی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور کسی کے ساتھ رشوت کے بارے میں بحث مباحثے میں نہ اُلجھے۔

بحالی کے چند ماہ تک فقیرا روزانہ سفید شلوار قمیض پہنے سائیکل پر سوار اپنے دفتر جاتا، سارا دن اپنی ٹیبل پر بیٹھ کر کام کرتا، اور دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد دوبارہ سائیکل پر سوار گھر واپس پہنچ جاتا۔ اس کے رویۓ میں تبدیلی سے اس کے ساتھی بظاہر مطمئن تھے لیکن انہیں اس کی دفتر میں موجودگی سے سخت وحشت ہوتی۔

اسے اپنے درمیان بیٹھے دیکھ کر انہیں محسوس ہوتا کہ کوئی وہاں بیٹھا نہ صرف ان کے ہر فعل کو دیکھ رہا ہے اور ان کی حرکتوں پر نظر رکھ رہا ہے بلکہ ان کے خلاف وہ کسی وقت انکوائری بھی شروع کروا سکتا ہے۔

پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ چپڑاسی سے لے کر ایکسین تک سب رشوت میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں اس لیے انکوائری کون کرے گا؟

چنانچہ انہوں نے فقیرے کی واپسی کو مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی موجودگی سے بے نیاز ہوگئے۔ ایک دن انہیں اطلاع ملی کہ ان کے محکمے کے وزیر سرکاری دورے پر ان کے دفتر میں تشریف لا رہے ہیں۔

وزیر صاحب کے دورے کی اچانک اطلاع سے سارے ملازمین پریشان ہوگئے۔ ان کے دل وسوسوں اور خدشوں میں ڈوب گئے۔ انہوں نے اوورسیر صاحب سے مل کر خدشے کا اظہار کیا کہ فقیرا رشوت میں سے اپنا حصہ وصول نہیں کرتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وزیر صاحب تشریف لائیں وہ انہیں دفتر میں پائی جانے والی رشوت کے بارے میں باخبر کر دے۔ انہوں نے اوورسیر صاحب سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس دن اسے دفتر سے دور رکھیں۔ ملازمین کے خدشات کے پیش نظر اوورسیر صاحب نے فقیرے سے کہا وہ چاہتے ہیں کہ جس دن وزیر صاحب دورے پر آرہے ہیں وہ دفتر سے چھٹی کر لے۔ اوورسیر صاحب کے کہنے پر فقیرے نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ اس دن چھٹی کرے گا اور کام پر نہیں آئے گا۔

کرنے کو اس نے اوور سیر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ وہ وزیر موصوف کے دورے کے دن دفتر نہیں آئے گا لیکن پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ عین وزیر کے دورے کے دن اس نے ایک کتبہ بنایا جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا کہ محکمہ انہار میں رشوت ختم کی جائے۔ پھر حسب معمول صبح ناشتہ کیا، سفید شلوار قمیض پہنی اور سائکل پر سوار ہو کر دفتر جانے کی بجائے گاؤں کی طرف آنے والی سڑک کے کنارے جا کر کتبہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

دن چڑھے جب اس نے جھنڈے والی گاڑی ہائی وے سے اتر کر گاؤں جانے والی سڑک پر آتے دیکھی تو اس نے سڑک کے بیچوں بیچ کتبہ لہرانا شروع کر دیا۔ وزیر صاحب نے جب اپنے محکمے میں رشوت کے بارے میں کتبہ دیکھا تو ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ پھر انہوں نے فقیرے کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ وہ کیسے جانتا ہے کہ محکمہ انہار کے دفتر میں رشوت چلتی ہے۔ اس نے وزیر صاحب کو بتایا کہ وہ محکمے میں بطور کلرک کام کرتا ہے۔ محکمے میں ہر ماہ زمین داروں کی طرف سے ملنے والے رشوت کے پیسوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ رشوت میں سے اس کے سوا نیچے سے لیکر اوپر تک سب اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اس نے وزیر صاحب کو بتایا کہ ایک بار اس نے انہیں رشوت لینے سے منع کیا تو انہوں نے اس کے خلاف سازش کر کے اس کی ملازمت ختم کر دی۔

فقیرے کی گفتگو سن کر وزیر آبپاشی محکمہ انہار کے دفتر پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے اوور سیر صاحب سے پوچھا کہ فقیرے کو ملازمت سے نکالے جانے کے بعد بحال کس نے کیا تھا۔ اوور سیر نے وزیر کو بتایا کہ فقیرے کو ملازمت ایکسین صاحب نے دی تھی، پھر ملازمت سے نکالا بھی انہوں نے تھا اور بعد میں معافی تلافی کے بعد بحال بھی انہوں نے کیا تھا۔

وزیر کے دورے کی وجہ سے ایکسین صاحب بھی وہیں دفتر میں موجود تھے۔ اوور سیر کی بات سن کر وزیر نے دفتر کے ٹائپسٹ کو بلا کر تین آرڈر ٹائپ کرائے۔

ایک آرڈر میں انہوں نے فقیرے کی برطرفی کا نوٹس جاری کیا۔ دوسرے میں ایکسین صاحب کی برطرفی کا اور تیسرے میں اوورسیر صاحب کی بطور ایکسین پروموشن کا۔

دفتر سے وزیر صاحب کے حکم سے دوبارہ برطرفی کے بعد فقیرے کا روزانہ کا معمول ہے کہ وہ علی الصبح سفید شلوار قمیض پہنے، سائیکل پر سوار، ہائی وے سے گاؤں کی طرف آنے والے سڑک کے کنارے جا کر کتبہ پکڑ کر کھڑا رہتا ہے۔ کتبے پر اب بھی موٹے موٹے حروف میں لکھا ہے کہ محکمہ انہار میں رشوت ختم کرو۔

آنے جانے والے لوگ کہتے ہیں کہ فقیرا پاگل ہو گیا ہے۔ فقیرا کہتا ہے لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ کون پاگل ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن فقیرے کی ماں اب بھی ہر صبح اسے ناشتہ کھلا کر، کتبہ تھما کر، کام پر جانے کا کہتی ہے۔

اگر کبھی فقیرا سُستی دکھاتا ہے تو پہلے وہ اسے محبت سے چمکارتی ہے کہ وہ اٹھے اور کام پر جائے۔ اگر وہ کوئی بہانہ بناتا ہے تو وہ اسے دھمکی دیتی ہے کہ اگر وہ کام پر نہیں جائے گا تو وہ خود کتبہ اٹھا کر سڑک کے کنارے جا کر کھڑی ہو جائے گی۔

لوگ کہتے ہیں فقیرا پاگل ہو گیا ہے۔ لیکن فقیرا کہتا ہے کہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ کون پاگل ہے فقیرا یا لوگ اس کا فیصلہ آپ لوگوں پر منحصر ہے۔

غلام

گارسن صبح اٹھتے ہی پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے غلام آباواجدار کی تعریف میں ایک گیت گاتا۔ یہ گیت اسی نے خود ہی گھڑا تھا۔ عجیب بے ربط اور بے معنی گیت تھا لیکن وہ اس گیت سے اپنے دن کا آغاز مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتا۔ جیسے ہی اس کی فرینک سناٹرا جیسی دھن بلند ہوتی اس کا انڈین دوست وجے اسے گالی دے کر خاموش ہونے کی تلقین کرتا۔ لیکن گارسن وجے کی گالیاں سننے کے باوجود اپنا راگ جاری رکھتا۔

"تم جنہیں جہازوں میں بھر کر
افریقا کے جنگلوں سے
لایا گیا
وہ منڈیاں بھی کیا منڈیاں تھیں
جن میں تمہاری بولی لگی
تمہارے بد صورت موٹے کالے ہونٹ
سسکتے رہے
دام لگتے رہے
تم یونہی برس ہا برس بکتے رہے
تم جنہیں جہازوں میں بھر کر
افریقا کے جنگلوں سے
لایا گیا
تمہاری نظر
آسماں پر چمکتے ستاروں پر تھی

تمہاری جاں
شکنجوں میں اٹکی رہی
تمہارے بدصورت موٹے کالے ہونٹ
سسکتے رہے
دام لگتے رہے
تم یونہی برس ہابرس بکتے رہے"

وجے گالیاں دیتا، کبھی کان سرہانے میں دبا کر سونے کی کوشش کرتا، لیکن گارسن گاتا رہتا جب تک کہ وجے اٹھنے پر مجبور نہ ہو جاتا۔ گارسن اور وجے دونوں یوسی برکلے کے طالب علم تھے۔ گارسن ٹینسی کا رہنے والا تھا جہاں اس کے آباؤاجداد کسی زمانے میں پلانٹیشنز پر غلاموں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ جبکہ وجے کے ماں باپ انڈیا سے ہجرت کر کے امریکہ آئے تھے۔ لاس اینجلس میں ان کا گروسری اسٹور تھا۔ وجے اور اس کی بہن سپیتمی کی پیدائش امریکہ میں ہوئی تھی۔ دونوں پڑھائی لکھائی میں تیز تھے۔ لاس اینجلس ہائی سے گریجویشن کے بعد دونوں کو یوسی برکلے میں داخلہ ملا تھا۔

دونوں بہن بھائی برکلے آئے تو انہوں نے رہائش کے لیے یوسی کے پاس ہی ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ گارسن کو ابھی تک رہنے کے لیے جگہ نہیں ملی تھی اس لیے وجے نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی تھی۔

ہوٹل سے وجے اور سپیتمی کے ساتھ منتقل ہونے سے پہلے گارسن نے انہیں بتا دیا تھا کہ اسے علی الصبح گانے کی عادت ہے۔ اس کی آواز اتنی اچھی نہیں ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے دن کا آغاز اسی گیت سے کرتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اور اپنے آباؤاجداد کی تاریخ کو فراموش کرے۔

وجے کے برعکس سپتمی کو گارسن کا گانا اچھا لگتا۔ جیسے ہی علی الصبح گارسن کے گانے کی تان بلند ہوتی سپتمی اٹھ جاتی۔ وہ اٹھ کر اپنے اور گارسن کے لیے چائے بناتی۔ گارسن کے گانے کی تعریف کرتی۔ پھر دونوں چائے پینے کے لیے بیٹھ جاتے۔ اور دونوں میں گپ شپ شروع ہو جاتی۔

سپتمی کہتی: "گارسن تمہارے گیت میں بہت درد ہے۔ تمہارا گیت سن کر مجھے ہندوستان کی غلامی کا دور یاد آتا ہے۔ میں امریکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ مجھے ہندوستان میں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن میرے ماں باپ اور ان کے دوست کبھی کبھار ہندوستان کی طویل غلامی کی بات کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں مجھے تمہارے گیت جیسے درد کے احساس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

گارسن سپتمی کی بات سنتا تو کہتا: "میں یہ گیت گا کر خود کو یقین دہانی کراتا ہوں کہ دنیا سے غلامی کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے آباؤاجداد سے زیادہ بدتر غلامی میں مبتلا ہیں۔ میرے آباؤاجداد کو افریقا سے زنجیریں ڈال کر امریکہ اور یورپ لایا گیا تھا لیکن اب پوری دنیا سے لوگ خود بخود غلامی کرنے کے لیے یورپ اور امریکہ کھنچے چلے آتے ہیں۔ پہلے یہاں آنے کے لیے سو سو طرح کے جتن کرتے ہیں پھر کوشش کرتے ہیں کہ جس حد تک ممکن ہو یورپی اور امریکی رنگ ڈھنگ اپنائیں۔ اگر خود نہ اپنا سکیں تو اپنے بچوں کو یورپی اور امریکی کلچر کا شاہکار بنا دیتے ہیں۔"

وجے گارسن اور سپتمی کی گفتگو سنتا تو سرہانہ ایک طرف پھینک کر گارسن کو ہندی میں الٹی سیدھی گالیاں دینی شروع ہو جاتا۔ گارسن اس کی گالیاں سن کر ہنس دیتا۔ وجے اور سپتمی کے امریکی لب و لہجے سے گارسن کو اندازہ تھا کہ یہ بھی ان غلاموں کی اولاد ہیں جو غلامی کی خاطر خود بخود امریکہ کھنچے چلے آتے ہیں اور یہاں آکر اپنی شکل و صورت کے علاوہ ہر چیز بدل لیتے ہیں۔

وہ ہنستے ہوئے وجے سے کہتا: " وجے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ماں باپ سے ٹھیک طرح سے ہندی گالیاں ہی سیکھ لو۔ جب تم امریکی لہجے میں مجھے ہندی گالیاں دیتے ہو مجھے اپنے آباؤاجداد کے دکھ یاد آ جاتے ہیں۔"

وجے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتا: "میری بگڑی ہوئی ہندی گالیوں کا تمہارے آباؤاجداد کے دکھوں کے ساتھ کیا تعلق؟

گارسن کہتا: " ان گالیوں کا میرے آباؤ اجداد کے غلامی میں اٹھائے گئے دکھوں سے وہی تعلق ہے جو میرے گیت کا ہے۔ میں امریکی انگریزی میں گیت گاتا ہوں تو مجھے اپنی بدقسمتی کا احساس ہوتا ہے کہ میں زنجیروں میں جکڑے، شکنجوں میں کسے، اپنے آباواجداد کی غلامی کے دکھوں کا اظہار بھی ان کی زبان میں کرتا ہوں جنہوں نے ان پر غلامی کی ذلت مسلط کی تھی۔ کاش مجھے اپنے آباؤاجداد کی زبان آتی۔ کاش میں یہ گیت انہی کی زبان میں گا سکتا۔ تاکہ ان کی روحیں جان جاتیں کہ ان کا کوئی بیٹا اب بھی ان کے افریقا سے امریکہ تک پر مصائب سفر کی کہانی دنیا کو سنا رہا ہے"۔

گارسن یہ بات کچھ ایسی دردمندی سے کہتا کہ اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھرّا جاتی۔ سپتمی اسے تسلی دیتی۔ اس کی دلجوئی کرتی۔

اسے بتاتی کہ اب اسے اپنے آباؤ اجداد کی غلامی کے مسئلے پر اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ صدیوں قبل گزرے واقعات پر آدمی کو اس طرح دکھی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کا حال بے حال ہو جائے۔ وجے گارسن سے اتنی ہمدردی دکھانے پر بہن کو شُشکارتا۔

انہی باتوں میں اسکول جانے کا وقت ہو جاتا۔ وہ تینوں بیگ کندھوں پر ڈال کر اپارٹمنٹ سے کیمپس جانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ گارسن اور وجے کی کلاسیں ایک ہی تھیں اس لیے وہ اکھٹے اپنی کلاسوں میں پہنچتے جبکہ سپمتی مختلف کلاسوں میں ہونے کے باعث کیمپس کے گیٹ پر ان سے جدا ہو جاتی۔

جاتے جاتے وہ گارسن کو تلقین کرتی کہ وہ دن بھر اپنے آباؤاجداد کی غلامی کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنے لیکچروں پر توجہ دے تاکہ وہ پڑھائی لکھائی سے اپنے حال کو اپنے آباؤاجداد کی زندگیوں سے بہتر بنا سکے۔

گارسن نے انتہائی ملائمت سے سپیتمی کا شکریہ ادا کیا۔ جب کہ اس نے بھی مسکراتے ہوئے اپنی راہ لی۔

کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے

وجے نے پھر گارسن کی دکھتی رگ چھیڑی۔

"گارسن یہ جو تم صبح اٹھ کر گیت گاتے ہو اس کے بارے میں تمہیں میرا ایک مشورہ ہے۔ گیت گانے کے علاوہ اگر تم گٹار بجانی سیکھ لو اور یہ گیت صبح صبح اپارٹمنٹ میں گانے کی بجائے گٹار کے ساتھ ٹیلیگراف پر گایا کرو تو اپنے لیے چند سکے بھی اکٹھے کر سکتے ہو۔"

گارسن نے وجے کا منہ چڑاتے ہوئے جواب دیا کہ اسے گٹار بجانی آتی ہے۔ لیکن سکے اکھٹے کرنے کے لیے اسے گٹار بجانے کی ضرورت نہیں۔

گارسن اور وجے کلاس روم میں پہنچے تو سوشیالوجی کے پروفیسر جیمز اپنا لیکچر شروع کر چکے تھے۔ ان کے لیکچر کا موضوع تھا جنس اور کلچر۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جنس اگرچہ زندگی کا ایک بنیادی وظیفہ ہے لیکن انسانی سماج میں یہ کئی ایسی ثقافتی شکلیں اختیار کرتی ہے جن پر مختلف دلچسپیوں کے حامل گروپ طرح طرح کے لیبل اس طرح چڑھاتے ہیں کہ اصل موضوع غائب ہو جاتا ہے۔

جدید انسان نے جس طرح غلامی کو جاری رکھنے کے لیے ایسے معاشی سسٹم ایجاد کئے ہیں کہ انسان خود بخود رضامندی سے انتہائی خوشی کے ساتھ غلامی کی غیر مرئی زنجیریں پہن لیتا ہے اور پھر ساری عمر کتے کی طرح سسٹم کی خدمت سرانجام دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح جنس غیر محسوس رضامندی سے کئی ایسے ثقافتی روپ اختیار کرتی ہے کہ اس کا اصل وظیفہ غائب ہو جاتا ہے اور تجارتی مقاصد ٹیک اوور کر لیتے ہیں۔

پروفیسر صاحب بول رہے تھے اور گارسن اور وجے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وجے نے گارسن سے دھیمے لہجے میں کہا:

"سالے صبح غلامی پر تمہارا گیت سنا تھا یہاں پروفیسر صاحب بھی اسی موضوع پر گفتگو فرما رہے ہیں۔"

پروفیسر جیمز نے وجے کو گارسن سے کانا پھوسی کرتے دیکھا تو انہوں نے اسے پوچھا کہ وہ گارسن سے کیا کہہ رہا ہے۔ وجے نے پروفیسر صاحب کو بتایا کہ گارسن ہر صبح اپنے آباو اجداد کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے ایک گیت گاتا ہے اس کے گیت اور آپ کے لیکچر کا موضوع ایک ہی ہے۔

پروفیسر جیمز کا تعلق بھی افریقی امریکن کمیونٹی سے تھا۔ وجے کی بات سن کر انہوں نے گارسن سے درخواست کی کیا وہ ان کے اور اپنے دیگر ہم جماعتوں کے لیے وہ گیت گانا پسند کرے گا۔ پروفیسر صاحب کا حکم بجالاتے ہوئے گارسن نے سر کلاس صبح والا گانا اپنے ہم جماعتوں کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیا:

کلاس میں ایک لڑکے کے پاس اس کی گٹار تھی۔ گارسن نے گانا شروع کیا تو اس طالب علم نے گٹار باکس سے نکال کر بجانا شروع کر دی۔

"تم جنہیں جہازوں میں بھر کر
افریقا کے جنگلوں سے
لایا گیا
وہ منڈیاں بھی کیا منڈیاں تھیں
جن میں تمہاری بولی لگی
تمہارے بدصورت موٹے کالے ہونٹ
سسکتے رہے
دام لگتے رہے
تم یونہی برس ہابرس بکتے رہے

تم جنہیں جہازوں میں بھر کر
افریقا کے جنگلوں سے
لایا گیا
تمہاری نظر
آسماں پر چمکتے ستاروں پر تھی
تمہاری جاں
شکنجوں میں اٹکی رہی
تمہارے بد صورت موٹے کالے ہونٹ
سسکتے رہے
دام لگتے رہے
تم یونہی برس ہا برس بکتے رہے"

گارسن کے گیت اور ساتھی طالب علم کی گٹار سے کلاس روم کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ گارسن کا گیت ختم ہوا تو پروفیسر صاحب نے اپنا چشمہ اتار کر اپنی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ پھر انہوں نے طالب علموں کو دعوت دی کہ وہ غلامی، جنس اور کلچر کے موضوع پر اپنے اپنے تاثرات پیش کریں۔

پروفیسر صاحب کی دعوت عام سن کر ایک چینی لڑکی کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا کہ اس کا اصل نام جن یی ہے لیکن اس نے اپنی اور امریکیوں کی سہولت کے لیے اپنا نام جینی رکھ لیا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ اس کا تعلق امریکہ میں آباد چوتھی نسل کے چینیوں سے ہے۔ اس کے پردادا ریلوے لائن بچھانے کے لیے امریکہ آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے تھے۔

لیکن آج بھی اُسے اس کی چینی ثقافتی وراثت بعض اوقات حزن کا شکار کر دیتی ہے۔ صبح کے وقت سکول آنے سے پہلے جب وہ آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتی ہے تو کبھی کبھار وہ اپنے بارے میں کنفیوزن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اُسے اکثر یہ سوال تنگ کرتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کیا وہ چینی ہے یا امریکن؟

جب وہ اپنی شکل کو دیکھتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ وہ چینی ہے۔ لیکن پھر اسے یاد آتا ہے کہ اسے چینی زبان نہیں آتی۔ چینی رسم ورواج اور کلچر کے ساتھ اس کا وہ تعلق نہیں جو چین میں رہنے والے چینیوں کا ہے۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر وہ ایک چینی لڑکی ہے لیکن اس میں امریکی جن حلول کر گیا اور اب وہ میرے جسم کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

وجے نے جینی کی بات سنی تو گارسن سے کہا: "میں سمجھتا تھا تیرا اگیت ایک بکواس کے سوا کچھ نہیں لیکن جینی کی بات سن کر لگتا ہے کہ یہ مسئلہ کچھ زیادہ گھمبیر ہے"۔

گارسن نے کہا: "مجھے لگتا ہے تم اپنے بزرگوں کی بات توجہ سے نہیں سنتے۔ ہندوستان صدیوں تک غلام رہا ہے۔ ہندوستان کی روح میں چھپا درد تمہارے لب ولہجے سے بھلے غائب ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارے بزرگ اب بھی اس غلامی کی صدیوں طویل رات کو یاد کر کے ضرور ملول ہوتے ہوں گے۔"

پروفیسر جیمز نے وجے اور گارسن کو باہمی گفتگو کرتے دیکھا تو وجے سے کہا کہ فقط گارسن سے بات کرنے کی بجائے وہ اپنے ہم جماعتوں سے اپنے خیالات شیر کرے تو زیادہ مناسب رہے گا۔

پروفیسر جیمز کے کہنے پر وجے نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عہد حاضر کے ہندوستان کی ساخت میں اتنی تہذیبوں نے اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے جراثیم داخل کئے ہیں کہ ہم تقریباً بھول گئے ہیں کہ اصل ہندوستان کیسا تھا۔ ہمارے آباؤاجداد کا رہن سہن کیسا تھا۔ رسم ورواج کیسے تھے۔ بول چال کیسی تھی۔

انگریزوں کے ہندوستان آنے سے پہلے ہمارے بزرگوں نے پوری کوشش کی کہ وہ ہندوستان کی روح کو زندہ رکھیں۔ ہندوستان میں یونانی آئے، ایرانی آئے، افغانی آئے لیکن ان کی غلامی میں جانے کے

باوجود ہماری روح آزاد رہی۔ انگریزوں نے ہمارے ساتھ وہی کیا جو امریکہ نے جینی کے ساتھ کیا ہے۔
اب ہم ہندوستانی کم اور گورے زیادہ ہیں۔
ہماری زبان، ہمارا کلچر، ہمارے رسم ورواج، ہماری سوچیں، ہمارا طرز استدلال، ہمارا طرز زندگی ہندوستانی کم اور امریکی وبرطانوی زیادہ ہے۔
ہماری روائیتوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن ہم اپنی روائیتوں کا دفاع کرنے کی بجائے برطانوی اور امریکی روائیتوں کا دفاع زیادہ کرتے ہیں۔
انگریزوں نے ہمارے اخلاقی، سماجی، تاریخی اور سیاسی معیار بدل دیئے ہیں۔ اب ہم نہیں جانتے ہمارا کیا ہے۔ ہم نے ہر وہ چیز اپنالی ہے جو برطانیہ اور امریکہ نے ہم پر مسلط کی۔
ہندوستان ایک ارب سے زیادہ انسانوں کا ملک ہے لیکن ان ارب انسانوں کے ملک میں چند کروڑ انسانوں کا ایک جزیرہ ہے جو برطانوی اور امریکی قدروں کا ہو بہو عکس ہے۔ اس جزیرے کی حقیقت باقی ایک ارب ہندوستانیوں کی حقیقت سے مختلف ہے۔ لیکن یہ چند کروڑ ہندوستانی جدید ہندوستان کا چہرہ مہرہ ہیں جبکہ باقی کروڑوں ہندوستانی اس سارے بندوبست میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔
وجے بول رہا تھا اور ساری کلاس پورے انہماک سے سن رہی تھی۔ خود گارسن کو اندازہ نہیں تھا کہ صبح صبح اس کے گیت پر اسے گالیاں دینے والا وجے جدید طرز غلامی کی باریکیوں کو اس طرح سمجھتا ہے۔
سوشیالوجی کی کلاس ختم ہوئی تو گارسن اور وجے ٹیلیگراف پر واقع ایک کیفے میں جا بیٹھے۔
تھوڑی دیر میں اپنی کلاس سے فارغ ہو کر سپیتمی بھی وہیں آ گئی۔ اس نے گارسن اور وجے کو کیفے میں بیٹھے دیکھا تو وہ بھی ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔
وجے اور گارسن نے اپنے لیے کیپو چینو آرڈر کیا تھا جبکہ سپیتمی نے موکا کی خواہش ظاہر کی۔
گارسن نے سپیتمی کے لیے موکا آرڈر کیا اور پھر اس سے بولا: "سپیتمی آج تمہارے بھولے بھالے بھائی

وجے نے سوشیالوجی کی کلاس میں کمال کر دیا ہے۔ پہلے میں اسے ایک گھامڑ ہندوستانی سمجھتا تھا۔ اب مجھے اس میں چھپا ایک دانشور دکھائی دیتا ہے جو جدید دنیا کی غلامی کی غیر مرئی زنجیروں کو اسی طرح پہچانتا ہے جیسے میں اپنے آباؤاجداد کی مرئی زنجیروں کو پہچانتا ہوں اور آج بھی ان کی بے چین روحوں کو سکون پہنچانے کے لیے ہر صبح ان کے لیے گیت گاتا ہوں۔"

سپیتمی نے گارسن سے پروفیسر جیمز کی کلاس کی کہانی سنی تو موکے کی چسکی لگاتے ہوئے کہنے لگی۔

"گارسن یہ تمہارے گیت کا اثر ہے ورنہ وجے ایسی چیزوں پر کم ہی توجہ دیتا ہے۔"

گارسن نے کیپوچینو کا کپ دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور پھر کپ منہ تک لاتے ہوئے بولا: "لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب اسے صبح صبح میرا گیت سننے کو نہیں ملے گا کیونکہ ہاؤسنگ آفس نے میرے لیے ڈام میں ایک کمرے کا بندوبست کر دیا ہے۔"

وجے جو اب تک خاموش بیٹھا گارسن اور سپیتمی کی گفتگو سن رہا تھا کہنے لگا: "گارسن تمہارے گیت نے میری روح کو دُکھی کر دیا ہے۔ کیا اب تم مجھے میری ہزاروں سال کی غلامی کے درد سے آشنا کر کے ڈام میں منتقل ہو جاؤ گے ؟"

اس سے پہلے کہ گارسن کچھ کہتا سپیتمی بولی: "میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک میوزک گروپ بنانا چاہیئے۔ گارسن تم اپنے آباؤ اجداد کی بھٹکتی روحوں کو سکون پہنچانے کے علاوہ ایک نیا گیت لکھو جس میں عہد حاضر کے بھٹکے ہوئے زندہ غلاموں کی روحوں کو جھنجوڑو اور انہیں بتاؤ کہ امریکہ اور یورپ کی اندھا دھند فکری و ثقافتی و سیاسی و معاشی غلامی کے بجائے اپنی اصل کو پہچانیں۔ جدید غلامی کی زنجیریں پوری انسانیت کو تباہی کی ایسی منزل کی طرف لے جا رہی ہیں جہاں کچھ نہیں بچے گا۔"

گارسن نے سپیتمی کی بات سنی تو کہنے لگا کہ یہ ایک بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ یہ گیت وہ تنہا نہیں لکھے گا۔ یہ گیت افریقہ اور ایشیا کے غلاموں کی اولاد مل کر لکھے گی۔

پھر گارسن نے اپنے پہلے گیت کی طرز پر مصرعہ اٹھایا:

"ہم جو جہازوں میں بھر کر
افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سے
یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں
بکنے کے لیے
لہر در لہر چلے آتے ہیں"
سیپتمی نے اگلی چند لائنیں الاپیں
"ہم جن کی شکلیں
چینی، جاپانی، اور ہندوستانی ہیں
لیکن روحیں
برطانوی اور امریکی ہیں"
وجے نے گارسن اور سیپتمی کے گیت کو آگے بڑھایا:
"ہم غلاموں کے بیٹے
نہیں جانتے
آزادی کا مفہوم کیا ہے۔
ہم جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں
ان سے ہمارے جسم نہیں
ہماری روحیں لہو سے تر بہ تر ہیں"
تینوں نے اپنا اپنا ڈرنک ختم کیا اور پھر یہ گاتے ہوئے اکٹھے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوئے:
"ہم جو جہازوں میں بھر کر
افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سے

یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں
بکنے کے لیے
لہر در لہر چلے آتے ہیں
ہم غلاموں کے بیٹے اور بیٹیاں
نہیں جانتے
آزادی کا مفہوم کیا ہے
ہم چینی، جاپانی اور ہندوستانی
شکلوں میں قید
وہ بدصورت روحیں ہیں
جن کے لیے جنم لینا
کسی طور ممکن نہیں"

تینوں یہی گیت گاتے اپارٹمنٹ پہنچے تو سپیتمی نے گارسن سے کہا کہ وہ سارا دن اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکی۔ گارسن نے وجہ پوچھی تو
کہنے لگی۔ اس کی وجہ اس کا صبح کا گیت ہے۔

گارسن سپیتمی کی بات سن کر ہنسنا شروع ہو گیا۔ اور پھر ہنستا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وجے نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح ہنس رہے تھے جبکہ سپیتمی کا شرم سے چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔
جب وہ ہنستے ہنستے تھک گئے تو سپیتمی نے ناراضگی سے ان دونوں سے ان کی ہنسی کی وجہ پوچھی۔ لیکن گارسن اور وجے دونوں خاموش رہے۔ انہوں نے سپیتمی کو کچھ بتانے سے گریز کیا۔
اگلے دن صبح ہی صبح جبکہ سپیتمی اور وجے سو رہے تھے گارسن نے اپنا گیت الاپنا شروع کر دیا۔
"تم جنہیں افریقا کے جنگلوں سے

لایا گیا

وہ منڈیاں بھی کیا منڈیاں تھیں

جن میں تمہاری بولی لگی

تمہارے بدصورت موٹے کالے ہونٹ

سسکتے رہے

دام لگتے رہے"

ابھی گارسن نے گیت کے اتنے ہی بول الاپے تھے کہ سپتمی اُٹھ گئی۔ پھر نیم خوابیدہ لہجے میں گارسن سے کہنے لگی۔

"گارسن کیا تم اپنے گیت کی آخری لائنیں میرے لیے دوبارہ دہراؤ گے۔"

سپتمی کے کہنے پر گارسن نے دوبارہ اپنے گیت کی آخری لائنیں دہرائیں۔ "تمہارے بدصورت موٹے کالے ہونٹ

سسکتے رہے

دام لگتے رہے"

سپتمی کے کہنے پر گارسن نہ یہ لائنیں دوبارہ دہرائیں تو وہ گارسن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

"لیکن گارسن تمہارے ہونٹ تو نہ موٹے ہیں، نہ کالے اور نہ بدصورت پھر تم یہ گیت کیوں گاتے ہو۔"

گارسن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر کہا" یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ہونٹ اس طرح موٹے، کالے اور بدصورت نہیں جیسے اس کے آباؤاجداد کے تھے لیکن اس کی روح کے گھاؤ ابھی تازہ ہیں۔ وہ روزانہ جب پوری دنیا سے آنے والے غلاموں کو امریکی اور یورپی ملوں، فیکٹریوں، اور دوکانوں میں چند سکوں کے لیے کام کرتے دیکھتا ہے تو اس کی روح کے گھاؤ تازہ ہو جاتے ہیں۔ اسے اپنے زنجیروں میں جکڑے آباؤاجداد یاد آجاتے ہیں۔ ایسے میں اس کی روح تلملا اٹھتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے آباؤاجداد کو تو

زنجیروں میں جکڑ کر یہاں لایا گیا تھا لیکن اس دور کے غلاموں کو کن زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے کہ وہ یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔"

سپیتمی نے گارسن کی بات سنی تو کہنے لگی "اگر وہ چاہے تو وہ اس کی روح کے گھاؤ بھر سکتی ہے۔"

سپیتمی کی بات سن کر گارسن پھر گزشتہ شب کی طرح ہنسنا شروع ہو گیا۔ اب کے گارسن ہنسا تو سپیتمی ناراض ہو گئی۔

"گارسن میں سنجیدگی سے کچھ کہتی ہوں اور تم ہنسنا شروع کر دیتے ہو۔ رات بھی تم اور وجے میری بات سن کر ہنستے رہے۔

"ہم رات اس لیے ہنس رہے تھے کہ تم نے انجانے میں لڑکیوں والی بات کہہ دی تھی۔"

"لڑکیوں والی بات۔۔۔؟" سپیتمی نے استفہامیہ انداز میں گارسن کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں، ہاں، لڑکیوں والی بات۔ آخر میرے گیت میں ایسی کیا بات ہے کہ تم کل سارا دن اپنی پڑھائی پر فوکس نہ کر سکی؟"

گارسن کا جواب سن کر سپیتمی کی برافروختگی قدرے کم ہوئی اور وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ واقعتاً اس کے گیت میں ایسا کیا کچھ ہے کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کی بجائے سارا دن اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

پھر وہ خود ہی مسکرا اُٹھی۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ گیت کی بجائے گیت کار اس کے دل میں گھسا چلا آ رہا ہے۔"

اس خیال سے اسے ہلکی سی جھرجھری آئی۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ممی اور پاپا مجھے مار ڈالیں گے اگر میں نے کسی کالے لڑکے سے تعلق جوڑنے کے بارے میں سوچا۔"

وہ ان سوچوں میں گم تھی اور گارسن اپنے پھیپھڑوں کی پوری توانائی سے اپنا روزمرّہ کا گیت گا رہا تھا۔

"وہ منڈیاں بھی کیا منڈیاں تھیں

جن میں تمہاری بولی لگی

تمہارے بدصورت موٹے کالے ہونٹ

سسکتے رہے

دام لگتے رہے

تم یونہی برس ہا برس بکتے رہے"

گارسن کے گیت سے وجے بھی بیدار ہو گیا۔ اس نے بستر میں لیٹے لیٹے گارسن کو ایک موٹی سی گالی دی۔ اس سے پہلے کہ اس کی گالی کے جواب میں گارسن کچھ کہتا سپیتمی بول اٹھی۔

"وجے تم گارسن کو گالیاں کیوں دیتے ہو۔ حالانکہ اس کا گیت تمہیں بھی دل سے پسند ہے۔"

"مجھے نہ اس کا گیت پسند ہے نہ یہ خود۔ لیکن اس سالے میں کوئی بات ہے۔ کل میں نے ہی اسے ڈام میں منتقل ہونے سے روک دیا تھا۔ شاید اس کا صبح صبح گیت گانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس تم تو جانتی ہو کوئی بھی مجھے صبح صبح جگائے تو میرا جی چاہتا ہے اسے قتل کر کے دوبارہ سو جاؤں۔"

"ہاں، گھر پر ممی سے بھی اکثر تمہارا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ تمہیں اٹھنے کے لیے کہتی ہیں تو تم غرّانا شروع کر دیتے ہو۔"

گارسن خاموشی سے بہن بھائی کی گفتگو سن رہا تھا۔ پھر مداخلت کرتے ہوئے بولا: "اسے افسوس ہے کہ وہ علی الصبح گیت گاتا ہے۔ لیکن یہ گیت اس کے لیے ایسے ہی ہے جیسے صبح کے وقت ہندوں کے لیے بھجن گانا اور مسلمانوں کے لیے نماز پڑھنا۔"

"لیکن سالے تم تو کرسچین ہو۔ تم لوگ تو اتوار کے دن چرچ جاتے ہو۔ وہ بھی سورج نکلنے کے بعد۔ اپنا گیت بھی سنڈے مارننگز کے لیے محفوظ رکھا کرو۔ باقی چھ دن تو آرام سے سونے دیا کرو۔"

"ہندوازم، یہودیت، عسائیت اور اسلام بھی غلامی کی مختلف شکلیں ہیں۔ غلامی کیسے کیسے انسان کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیتی اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تم بھی میرے ساتھ علی الصبح اٹھ کر گیت گایا کرو۔ تمہاری روح بھی آزاد ہو جائے گی۔"

جواب میں وجے نے بستر میں لیٹے لیٹے گارسن پر فور لیٹر ورڈ کی بوچھاڑ کر دی۔ سپیتمی نے وجے کو بد کلامی کرتے سنا تو اس پر برس پڑی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں ایسی زبان استعمال کرنے پر۔ اگر تمہیں گارسن کا خیال نہیں کم از کم میرا خیال تو کرو۔"

وجے "سوری سِس، سوری سِس،" کرتے ہوئے بستر سے چھلانگ لگا کر باہر نکلا اور گارسن کے روبرو کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"چل گارسن تو بھی کیا یاد کرے گا۔ چل تیرا گیت گاتے ہیں۔"

پھر گارسن کی نقل کرتے ہوئے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے گانے لگا:

"تم جنہیں جہازوں میں بھر کر

ایشیا کے جنگلوں سے

لایا گیا"

ابھی اس نے گیت کے اتنے ہی بول گائے تھے کہ گارسن بول اٹھا:

"ایشیا نہیں افریقا۔"

"تم افریقا کہو میں ایشیا کہوں گا۔ کیونکہ تمہارے آباؤاجداد افریقا سے لائے گئے تھے لیکن میرے آباؤاجداد ایشیا سے آئے تھے یا لائے گئے تھے۔" وجے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دیکھو افریقا ایک استعارہ ہے۔ تم افریقا کی جگہ ایشیا لگاؤ گے تو گیت کی معنویت ختم ہو جائے گی۔"

سپیتمی نے دونوں کی بحث سنی تو تالیاں بجا کر دونوں کو خاموش کیا۔ پھر بولی: "چونکہ اصل گیت میں افریقا ہے اس لیے افریقا ہی لگے گا ایشیا نہیں لگے گا۔"

اسی بحث مباحثے میں اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔ تینوں نے اپنے اپنے بیگ گردنوں میں ڈالے اور اسکول جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اسکول میں سارا دن کلاسوں کی مصروفیت کے بعد گھر لوٹے تو اپارٹمنٹ کمپلیکس کے لان میں وجے اور سپیتمی کے ممی پاپا آئے بیٹھے تھے۔

سپیتمی بھاگ کر پہلے اپنی ممی اور پھر پاپا سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنے پاپا کے گال پر بوسہ دیا۔

ممی اور پاپا نے مسکرا کر وجے اور سپیتمی کی طرف دیکھا لیکن گارسن کو دیکھتے ہی ان کے ماتھوں پر بل پڑ گئے۔ پھر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اسے خوش آمدید کہتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے وجے اور سپیتمی کی طرف دیکھنے لگے۔

سپیتمی نے ماں باپ کے استفہامیہ انداز کو دیکھتے ہوئے ان کا گارسن سے تعارف کرایا۔ "یہ گارسن ہے۔ وجے کا کلاس فیلو ہے۔ ہمارے ساتھ ہی اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔"

سپیتمی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے پاپا نے آگے بڑھ کر گارسن سے ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگے۔

"گارسن تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" لیکن سپیتمی کی ممی معنی خیز نظروں سے گارسن کی طرف دیکھتی رہیں۔ انہوں نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

ان کے انداز سے لگتا تھا کہ انہیں وجے اور سپیتمی کی گارسن کے ساتھ دوستی پسند نہیں آئی۔

لیکن جب سپیتمی نے انہیں بتایا کہ وہ ان کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ میں رہتا ہے تو انہوں نے اشاروں کنائیوں میں سپیتمی کو پیغام دیا کہ انہیں کالے گارسن کا ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں۔

وجے نے ممی کو اشاروں کنائیوں میں بات کرتے دیکھا تو ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "گارسن برا

لڑکا نہیں ہے۔ بس اس سالے میں ایک ہی خرابی ہے۔ یہ صبح صبح اٹھ کر اپنے آباؤاجداد کی تعریف میں گیت گانا شروع ہو جاتا ہے۔"

یہی باتیں کرتے وہ سارے لان سے اٹھ کر اپارٹمنٹ کے اندر چلے آئے۔ وجے کے پاپا نے کہا" اگر ایسا ہے تو ہم بھی گارسن کا گیت سنیں گے۔" گارسن کہاں ہچکچانے والا تھا۔ اس نے وجے کے پاپا کی فرمائش سنی تو

فوراً راگ الاپنے لگا۔

"تم جنہیں جہازوں میں بھر کر

افریقا کے جنگلوں سے

لایا گیا

وہ منڈیاں بھی کیا منڈیاں تھیں

جن میں تمہاری بولی لگی

تمہارے بد صورت موٹے کالے ہونٹ

سسکتے رہے

دام لگتے رہے

تم یونہی برس ہا برس بکتے رہے"

وجے کے پاپا اور ممی نے گارسن کا گیت سنا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہیں امریکہ میں سیٹل ہونے کے لیے اپنی جدوجہد یاد آئی۔ انہیں یاد آیا کہ جب وہ امریکہ آئے تھے تو کتنے جوان تھے۔ ان کے جسموں میں کتنی توانائی تھی۔ ان کی جلد کتنی چمکدار اور بال کیسے سیاہ تھے۔ سپتمی کی ماں کتنی جوان اور خوبصورت تھی۔ کتنا ان دونوں کو عشق تھا ایک دوسرے کے ساتھ۔ پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے یہاں سیٹل ہونے کے لیے کیا کیا جتن کئے تھے۔ کس طرح حالات کا جبر اور سختیاں برداشت کی تھیں۔

انہی حالات میں کیسے وجے اور سپیتمی کی پیدائش ہوئی تھی۔ کس طرح انہوں نے ان کی دیکھ بھال کی اور انہیں پالا پوسا تھا۔ وجے اور سپیتمی نے اپنے ممی اور پاپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو بے قرار ہو گئے۔

گارسن نے بھی گانا بند کر دیا۔ پھر وجے اور سپیتمی کے پاپا اور ممی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"اس نے گیت انہیں دکھی کرنے کے لیے نہیں گایا تھا۔ اسے انہیں دکھی دیکھ کر افسوس ہوا ہے۔ اب وہ کبھی یہ گیت نہیں گائے گا۔"

"نہیں نہیں گارسن۔ تم یہ گیت ہمیشہ گاتے رہنا۔ یہ گیت تمہاری روح کی آواز ہے۔"

پھر وہ اٹھے اور انہوں نے وجے، سپیتمی اور گارسن کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ اور کہنے لگے۔ "بیٹے گارسن ہم سب غلام ہیں۔ ہم سب غلاموں کی اولاد ہیں۔ ہم شاید کبھی آزاد نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن تمہارا اور تمہارے جیسے اور گیت ہماری غلامی کی رات میں جلتے چراغ ہیں۔ ان چراغوں کو جلتے رہنا چاہیے۔ شاید ان گیتوں کی بدولت ہم کالے پیلے اور گندمی لوگ کبھی واقعتاً آزاد ہو سکیں۔" اپنے پاپا کی بات سن کر سپیتمی اپنے باپ سے لپٹ گئی اور بے اختیار ان کے گالوں کو چومنے لگی۔

خواب آور پتھر

پھر ایسا ہوا کہ سارے شہر کے مکینوں کو نیند نے آگھیرا۔

وہ جتنی کوشش کرتے کہ جاگتے رہیں ان کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ شہر کے مکینوں کی نیند کی وجہ سے زندگی کا کاروبار متاثر ہونے لگا۔ پہلے صحن خاموش ہوئے، پھر دریچے، پھر گلیاں پھر محلے اور پھر بازار۔

لیکن دن اور رات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ فطرتی مظاہر جس طرح کام کرتے ہیں ویسے ہی کرتے رہے۔ وقت پر سورج طلوع اور غروب ہوتا۔ وقت پر دن نکلتا اور ڈوبتا۔ وقت پر رات آتی، تارے نکلتے، چاند چمکتا، سحر ہوتی، غنچے چٹکتے، پھول کھلتے، صبح ہوتی، لیکن اس شہر خوابیدگاں کے مکیں اس سب سے بے نیاز سوئے رہتے۔

شروع میں ارد گرد کی بستیوں کے مکینوں کو اندازہ نہ ہوا کہ ان کی ہمسائیگی میں ایک بستی کے لوگوں پر نیند مسلط کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساری کی ساری بستی نیند میں کھو جائے اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

جب ارد گرد کی بستیوں کے لوگوں کو پتہ چلا تو انہوں نے مختلف طریقوں سے کوشش شروع کی کہ اس بستی کے مکینوں کو نیند سے بیدار کریں لیکن ان کی سب کوششیں ناکام ہوئیں۔

سب سے پہلے انہوں نے بستی میں نمائندے بھیجے کہ وہ گھر گھر جائیں اور لوگوں کو نیند سے بیدار کریں لیکن قریبی بستیوں کے جو نمائندے اس بدقسمت بستی میں سوئے ہُووں کو جگانے گئے بستی کی حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں بھی ابدی نیند نے گھیر لیا۔ ان میں سے کوئی لوٹ کر واپس نہ آیا۔

اپنے نمائندوں کا یہ حال دیکھ کر ارد گرد کی بستیوں کے مکینوں نے اپنی اپنی بستیوں میں عوامی اجتماع کئے تا کہ ملحقہ بستی کے غیر فطرتی نیند کے شکار لوگوں کو جگانے کا کوئی طریقہ سوچیں لیکن انہیں اس مسئلے کا کوئِ واضح حل سجھائی نہ دیا۔ وہ جتنا سوچتے اتنا ہی پریشان ہوتے۔ کیونکہ اس سے پہلے انہوں نے انسانی

تاریخ میں ایسے کسی واقعہ کے بارے میں نہ سنا تھا نہ پڑھا تھا۔ یہ ایک ایسا انوکھا واقعہ تھا جس کی تاریخ میں اور کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ اس انوکھی صورت حال سے دوچار آخر چند بستیوں کے مکینوں نے فیصلہ کیا کہ وہاں نمائندے بھجوانے کی بجائے ایسے جہاز بھجوائے جائیں جن میں شور وغل کے ایسے آلات لگے ہوں جن کے شور سے سونے والوں کو نیند سے بیدار کیا جاسکے۔

اتفاقاً ارد گرد کی بستیوں کے مکینوں کا یہ منصوبہ بھی سوئے ہووں کو جگانے میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ کیوں کہ منصوبے کے مطابق جیسے ہی خوفناک شور پیدا کرنے والے طیارے اس گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے ان کے پائلٹ چاہنے کے باوجود اپنی آنکھیں کھلی رکھنے میں ناکام رہے۔ انہیں نیند نے آگھیرا۔ وہ پوری کوشش کے باوجود خود کو نیند کی گرفت میں جانے سے نہ بچا سکے۔ چنانچہ ان کے جہاز پائلٹوں کی عدم توجہ کی وجہ سے ارد گرد کے درختوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گئے۔

اس دوران اس بستی کی صورت حال جوں کی توں رہی۔ نہ ان کی نیند ٹوٹی، نہ گھروں کے صحن اور دریچے چہکے، نہ گلیوں اور محلوں میں رونق لوٹی نہ بازار کھلے اور نہ زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔

آخر کار یہ مسئلہ ایک قومی مسئلے میں تبدیل ہو گیا۔ خوابیدہ لوگوں کی بستی کے واقعات سن کر سارے ملک کے لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔

ارد گرد کی بستیوں کے لوگوں کے علاوہ ملک کے سارے سیانے سر جوڑ کر بیٹھے کہ اس بلائے ناگہانی سے کیسے نبرد آزما ہوا جائے۔ سوئے ہوئے لوگوں کو کیسے گہری نیند سے جگایا جائے۔

سب سیانے سونے والوں کے بارے میں گفتگو کرتے۔ لیکن کسی کے پاس کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا۔ تقریروں پر سب کا زور تھا۔ لیکن سونے والوں کو کیسے جگایا جا سکتا ہے اس طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ سچ یہ ہے کہ ان سیانوں میں سے کوئی سوئے ہووں کو جگانے میں دلچسپی بھی نہیں رکھتا تھا۔ بظاہر وہ انہیں

جگانے کی باتیں کرتے لیکن تنہائی میں ایک دوسرے سے کہتے کہ ان کا سویا رہنا ان کے جاگنے سے زیادہ بہتر ہے۔ اس بستی کے لوگ بہت شر پسند ہیں جاگ جائیں تو مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیئے سوئے رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے بستی کے لوگوں کو گہری نیند سے جگانے کے لیئے پائلٹوں والے جہاز بھجوائے تھے اپنے پہلے منصوبے میں ناکامی کے بعد انہوں نے اس بستی میں بغیر پائلٹ جہاز بھجوانے شروع کر دیئے۔ بغیر پائلٹ جہاز بستی میں جا کر شور کرتے، اونچی نیچی پروازیں کرتے، پھر بغیر کوئی نقصان اٹھائے واپس لوٹ آتے۔ اگرچہ بغیر پائلٹ جہاز سوئے ہوؤں کو جگانے میں ناکام جا رہے تھے لیکن جہاز بھجوانے والوں کا خیال تھا کہ یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ بغیر پائلٹ جہازوں کے استعمال سے سونے والوں کو جگایا جا سکتا ہے۔ ملک کے سب سیانوں کا بھی اس بات سے اتفاق تھا کہ ان لوگوں کی نیند کا سوائے بغیر پائلٹوں والے جہازوں کی پروازوں کے کوئی حل نہیں۔ ان میں سے کئی ایک نے خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ جہاز انہیں عطا کر دیئے جائیں تو وہ خود انہیں سوئے ہوؤں کو جگانے کے لیے استعمال کریں گے لیکن ان کے گومگو کے رویئے کی وجہ سے بے پائلٹ جہازوں والے ان پر اعتبار کرنے سے گریزاں تھے۔

جب ان نئے کھلونوں کی اونچی نیچی پروازوں سے مسئلہ حل نہ ہوا تو بے پائلٹ جہازوں نے ان سوئے ہوئے لوگوں پر بم برسانے شروع کر دیئے۔ لیکن بموں کے دھماکوں اور ان سے پھیلنے والی تباہی کے نتیجے میں بھی وہ بھاری نیند سے بیدار نہ ہوئے۔ وہ جو چاہتے تھے کہ سوئے ہوئے لوگوں پر بم برستے رہیں رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

ان پر ایک ایسا خمار طاری ہوا کہ وہ نہ سوتے تھے نہ جاگتے تھے۔ بلکہ کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوئی کہ وہ تکلیف اور خوشی کے تصور سے آزاد ہو گئے۔ سوئے ہوؤں کی بستی پر بم گرتے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں۔ بتیسیاں کھل اٹھتیں اور وہ بم برسانے والوں کو ان کے ٹھیک ٹھیک نشانوں کی داد دیتے۔

کئی سال تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ نہ سوئے ہوئے نیند سے بیدار ہوئے۔ نہ تدبیر کرنے والوں کی تدبیریں کامیاب ہوئیں۔ نہ صحنوں کی خاموشی ٹوٹی نہ دریچوں کے کواڑ کھلے نہ گلی محلے آباد ہوئے نہ بازاروں کی رونق لوٹی۔ بلکہ بے پائلٹ جہازوں کے بموں سے وہ بستی ویران سے ویران تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس بستی کی نحوست ارد گرد کی بستیوں میں پھیلنے لگی۔ لوگوں کے اعصاب نیند میں جائے بغیر ایسے شل ہوئے کہ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔

آخر کار اس چھوٹی سی بستی کا مسئلہ ساری دنیا کا مسئلہ بن گیا۔ بڑے بڑے دماغ سوچ وبچار میں مصروف ہوئے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق سونے والوں کا مسئلہ گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتا گیا لیکن سب عالی دماغ گھسے پھٹے فارمولوں پر عمل کرتے رہے۔ زیادہ تر فارمولے پہلے بھی کئی بستیوں پر آزمائے جا چکے تھے لیکن وہ پھر بھی مصر تھے کہ انہی فارمولوں پر عمل جاری رکھیں گے۔

اس دوران کچھ بین الاقوامی ماہرین نے دریافت کیا کہ سونے والوں کی بستی کی نیند کی وجہ کچھ ایسے پتھر ہیں جن سے ہمہ وقت ایسی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں جن کی زد میں آنے والی ہر چیز پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔ اور سونے والے ایک ایسی مصنوعی کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں جس سے نکلنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ ان پتھروں کا اس زمین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ان کا تعلق خلا سے ہے۔ شاید ان میں سے کچھ اس آبادی میں گر گئے ہوں گے جن کی وجہ سے ہر ذی روح چیز پر نیند طاری ہے۔

اس انکشاف کے بعد سب قومی اور بین الاقوامی اداروں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ سوئے ہووں کو جگانے سے پہلے ان پتھروں سے نجات پانا ضروری ہے۔ اگر ان پتھروں سے نجات مل جائے تو سونے والے خود بخود جاگ جائیں گے۔ اس دریافت سے سونے والوں کی بستی کے ارد گرد بستیوں کے لوگ بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان پتھروں کو سونے والوں کی بستی سے نکالنے کے لیے بین الاقوامی

نمائندے آئیں گے تو اس سے کاروبار بڑھے گا۔ روپے پیسے کی ریل پیل ہو گی۔ ان کے دن بدل جائیں گے۔

لیکن بین الاقوامی اداروں والے لوگ بھی بین الاقوامی سطح پر اس طرح کی کاروائیاں کر کے سیانے ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس بات کی ذمہ داری تو قبول کی کہ وہ ان پتھروں کو اس بستی سے کسی نہ کسی طرح ہٹا دیں گے لیکن یہ سب پر واضح کر دیا کہ کسی کو کوئی روپیہ پیسہ نہیں دیا جائے گا۔ صرف بے پائلٹ طیاروں کی مدد سے ان پتھروں پر میزائیلوں سے نشانے لگائے جائیں گے اور انہیں تباہ وبرباد کر دیا جائے گا۔

اب صورت حال یوں ہے کہ بے پائلٹ طیارے رات دن ان پتھروں کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن جتنے پتھر تباہ ہوتے ہیں ان سے مزید ایسی شعاعیں بر آمد ہوتی ہیں جن سے نہ صرف اس بستی کے مکینوں کی نیند شدید سے شدید تر ہوتی جارہی ہے بلکہ ان شعاعوں کی وجہ سے ارد گرد کے بستیوں کے مکینوں پر بھی نیند طاری ہونے لگی ہے۔

سوئے ہووں کی بستی کے ارد گرد بستیوں کے لوگ پھیلتی ہوئی ابدی نیند کے اثرات سے متفکر ہیں۔ لیکن ریاستی کارپرداز گان کا خیال ہے کہ نیند ان کے لیے بہتر ہے۔ یہ شر پسند لوگ ہیں۔ جاگ جائیں تو شر پھیلاتے ہیں۔ ان کا سونا ان کے جاگنے سے بہتر ہے۔ چناچہ ان پتھروں پر بے پائلٹ طیاروں سے مزائیلوں کی بارش جاری رہنی چاہیے تا کہ ان سے اور زیادہ شعاعیں بر آمد ہوں جو کہ اور زیادہ لوگوں کو سلاسکیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

یہ کب تک جاری رہے گا کوئی نہیں جانتا۔ وہ بھی جو پتھروں کو تباہ کرنے کے لیے بغیر پائلٹ طیارے بھجواتے ہیں۔ اور ان کو بھی جن کی میزائیلوں کے حملوں کی بعد بتیسیاں کھل اٹھتی ہیں۔ اور سونے والوں کو بھی کیوں کہ وہ تو بہر حال سو رہے ہیں۔

پیشگوئیاں

بہت عرصہ قبل نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی کہ پاکستان میں ایک ایسا حکمران برسر اقتدار آئے گا جس کا ایک مقبول ترین خاندان سے تعلق ہو گا مگر یہ تعلق براہ راست نہیں ہو گا۔ وہ انتہائی غیر ذمہ دار، کرپٹ اور کھلنڈرا انسان ہو گا کہ لوگ نہیں چاہیں گے کہ وہ برسر اقتدار آئے لیکن اس طرح کے حالات پیدا ہوں گے کہ لوگوں کو اسے بطور حکمران تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کے حکمران بننے کے بعد پاکستان پر ایسی آفات نازل ہوں گی جن کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہو گی۔

ایوب خان نے اقتدار سنبھالا تو لوگوں کا کہنا تھا کہ یہی وہ حکمران ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی۔

ایوب خان کے دور میں ایسا بہت کچھ ہوا جس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔ پھر اس کے دور میں 1965 کی جنگ ہوئی جس میں بہت تباہی و بربادی ہوئی۔

ایوب خان کے بعد یحیٰ خان برسر اقتدار آیا تو لوگوں نے کہا ایوب خان کے دور میں وہ سب کچھ نہیں ہوا جس کی نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی۔ دراصل جس حکمران کی پیشگوئی نجومیوں نے کی تھی وہ ایوب خان نہیں یحیٰ خان ہے۔

یحیٰ خان کے دور میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں بے شمار قدرتی آفات آئیں۔ پھر جیسے یحیٰ خان شراب پیتا تھا اور ہر وقت عورتوں کے چکر میں رہتا تھا، بیشتر لوگوں نے کہا کہ یہی وہ حکمران ہے جس کے بارے نجومی قوم کو خبر دار کرتے رہے ہیں۔ لوگوں کا نجومیوں کی پیشگوئیوں پر اعتقاد اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا جب مشرقی پاکستان باقی پاکستان سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔

نجومیوں کی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے ان کا کہنا تھا کہ اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ پاکستان ٹوٹ گیا ہے۔ اس کا مشرقی بازو کٹ کر بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور یہ سب یحیٰ خان کی وجہ سے

ہوا ہے۔ جب ایوب خان کے خلاف تحریک چل رہی تھی اور عوام کی کامیابی کے واضح آثار نظر آرہے تھے اگر ہم نجومیوں کی وارننگ پر توجہ دے کر یحییٰ خان کو اقتدار میں آنے سے روک دیتے تو نہ پاکستان پر یہ آفات نازل ہوتیں اور نہ پاکستان ٹوٹتا۔

پاکستان ٹوٹنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو برسر اقتدار آئے تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ شکر ہے پاکستان کی تخلیق سے لیکر اب تک نجومی جو کچھ کہتے رہے ہیں سب کچھ گزر چکا ہے۔ اب پاکستان میں عوامی راج ہے۔ بھٹو مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں اور عوام کا حامی ہے۔ عام آدمی کی زندگی بہتر بنانے پر یقین رکھتا ہے۔ اس لیے اب کچھ ایسا نہیں ہونے کا جس کی نجومی پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اب ہمیں پاکستان اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں مطمئن ہو جانا چاہیے۔ ان خیالات سے پاکستان میں بے فکری کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ لوگ بیلوں اور اونٹوں کی طرح رقص کرنے لگے۔ میلوں ٹھیلوں کا رواج عام ہوا۔ سارے پاکستان میں سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد کی صدائیں گونجنے لگیں۔

پھر پاکستان میں دوبارہ ہنگامے شروع ہوگئے۔ لوگوں میں نجومیوں کی پیشگوئیوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ پیر فقیر بھی نجومیوں کے ساتھ پیشگوئیوں کی دوڑ میں شامل ہوگئے۔ بھٹو کے چھوٹنے یا لٹکائے جانے کے بارے میں نجومی اور پیر فقیر کبھی دبے اور کبھی کھلے لفظوں میں پیشگوئیاں کرنے لگے۔ نجومیوں کا خیال تھا کہ بھٹو کو لٹکا دیا جائے گا۔ پیروں فقیروں کا کہنا تھا کہ بھٹو کو سختی برداشت کرنی پڑے گی لیکن آخر کار چھوٹ جائے گا۔

اپریل کی ایک صبح، منہ اندھیرے، بھٹو کو لٹکا دیا گیا تو لوگ پھر نجومیوں کی پیشگوئیوں کی باتیں کرنے لگے۔ پھر اپنے ناخن دانتوں سے کاٹتے ہوئے انہوں نے سوگوار لہجوں میں نجومیوں کی پیشگوئیوں کی تکمیل پر ایک قسم کا اظہار اطمینان کیا۔

بھٹو کو لٹکانے کے بعد ضیا نے پہلے دن اپنی مونچھوں کو سرسوں کے تیل سے چمکایا۔ بالوں کو ویکس لگا کر سر پر چپکایا اور ٹی وی پر لوگوں کو قران سنایا تو لوگوں نے سوچا کہ اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ ضیا ایک ظالم آدمی ہے لیکن اللہ رسول کا نام لیتا ہے۔ شریعت کی باتیں کرتا ہے۔ اس لیے اب اس ملک کے دن پھر جائیں گے۔ یہ ملک جوڈنڈے کا عادی ہوچکا ہے، ضیا الحق کی زیر سایہ خوب پھلے پھولے گا۔ افغانستان پاکستان کا حصہ بنے گا۔ سمرقند و بخارہ کی منڈیاں مملکت خداداد کے تیار کردہ مال سے بھر جائیں گی۔ اس طرح اقبال کے خواب کو تعبیر ملے گی۔ پاکستان نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر اسلامی طاقت کا مرکز بنے گا۔ نجومی جائیں بھاڑ میں۔

لیکن نجومیوں کی پیشگوئیاں جاری رہیں۔ وہ پاکستان کے ستاروں کے مسلسل گردش میں رہنے کی باتیں کرتے رہے۔

اس دن واقعتاً لوگوں کو پاکستان کے ستارے گردش میں دکھائی دیئے جب ضیا الحق اپنے کتنے ہی اور جرنیلوں کے ساتھ گوشت کے لوتھڑوں کی شکل میں بہاولپور کے کھیتوں میں بکھر گئے۔

اب تک بھٹو کی روح تنہا پاکستان کی فضاؤں میں تیر رہی تھی۔ اس حادثے کے بعد ضیا کی روح بھی بھٹو کی روح کے ساتھ پاکستان کی فضاؤں میں تیرنے لگی۔

یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ نجومیوں کی پیشگوئیاں بھی جاری ہیں۔ پیر فقیر بھی اپنے موکلوں سے ملنے والی خبریں اپنے ماننے والوں کے ذریعے عوام میں پھیلاتے رہتے ہیں۔

پہلے نجومیوں اور پیروں فقیروں کی پیشگوئیوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا تھا۔ لیکن اب بھٹو اور ضیا کی روحوں کی فضا میں موجودگی کے بعد ان کے اختلافات ختم ہوچکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اب بھٹو اور ضیا کی روحیں ایک جگہ اکٹھا ہوگئی ہیں۔

اب وہ جو کچھ پاکستان کے بارے میں کہتے ہیں۔ اس کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اب نجومیوں کی پیشگوئیوں کا ذکر کریں تو لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔

گاہے روتے ہیں گاہے ہنستے ہیں۔ چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔ پاکستان کا وقت کہیں بھٹو اور ضیا الحق کے درمیان اٹک گیا ہے۔

نجومیوں نے کہا تھا ایک وقت آئے گا جب پاکستان میں ایک ایسا شخص حکمران ہو گا جس کا ایک مقبول ترین خاندان سے تعلق ہو گا لیکن اس کا اس خاندان کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ لوگ نہیں چاہیں گے کہ وہ برسر اقتدار آئے لیکن ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ وہ برسر اقتدار آئے گا۔ تب پاکستان پر ایسی آفات نازل ہوں گی جس کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہو گی۔ لیکن لوگ اب نجومیوں کی بات نہیں کرنا چاہتے۔ نجومیوں کا نام لیں تو وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔

جب کھلی آنکھ

حاجی علی احمد کی آنکھیں اِدھر دارالفنا میں بند ہوئیں اور اُدھر دارالبقا میں اس طرح کھلیں کہ فرشتوں نے انہیں داڑھی کے بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور گھسیٹتے ہوئے جہنم کی طرف لے جا رہے ہے۔ حاجی صاحب چیخ چلا رہے تھے، رحم کی درخواستیں کر رہے تھے، لیکن فرشتے تھے کہ سنتے نہیں تھے مسلسل گھونسے لاتیں مارتے جاتے تھے اور جہنم کی طرف گھسیٹے چلے جاتے تھے۔

حاجی صاحب نے جب دیکھا کہ منت سماجت سے کام نہیں بنتا تو رونا دھونا بند کیا اور سیدھے سبھاو فرشتوں سے عرض کی ایک بار انہیں حضور خداوندی میں پیش کیا جائے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ پانچ کی بجائے سات نمازیں پڑھیں، سات حج کئے، رمضان کے فرضی روزوں کے علاوہ سات نفلی روزے رکھے، سات بیویوں سے شادی کی، ہر بیوی میں سے سات سات بچے پیدا کئے۔ ساری عمر شریعت کے اصولوں کے مطابق گزاری پھر بھی ان کے ساتھ اس دارالبقا میں مجرموں والا سلوک کیوں ہو رہا ہے۔

فرشتوں نے حاجی صاحب کی بات سنی ان سنی کر کے ان کو جہنم کی جانب گھسیٹنا جاری رکھا۔ بس کہا تو اتنا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سب نمازیں، تمہارے سب حج، تمہارے سب روزے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے چنانچہ تمہاری سب محنت بیکار تھی۔ اب تم ہمیشہ جہنم میں رہو گے۔ اگر کبھی جہنم سے عام معافی کا اعلان ہوا تو شاید تمہیں معاف کر دیا جائے ورنہ اب جہنم کی آگ ہی تمہارا مقدر ہے۔ تم چاہو بھی تو اس سے نجات نہیں پا سکتے۔

حاجی علی احمد نے پھر فرشتوں سے استدعا کہ ایک بار، فقط ایک بار انہیں حضرت حق میں پیش کیا جائے وہ رحیم و کریم ہے۔ میں اس سے سننا چاہتا ہوں کے میری نمازیں، میرے حج، میرے روزے اور میری باقی نیکیاں کیونکر برباد ہوئیں۔

آخر حاجی صاحب کی آہ وزاری سے فرشتوں کا دل پسیجا اور انہوں نے انہیں گھسیٹنا روک کر اللہ تعالیٰ سے استدعا کی ایک بار وہ حاجی صاحب کی التماس سنے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی سرزنش کی اور حکم دیا کہ وہ حاجی صاحب کو جہنم رسید کریں کیونکہ وہ ان کو شرفِ باریابی عطا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کڑک حاجی صاحب نے بھی سنی۔ پھر رونا دھونا شروع کیا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے براہ راست استدعا کی کہ یہ شان خداوندی کے خلاف ہے کہ کسی مجرم کو اس کے گناہ بتلائے بغیر جہنم رسید کیا جائے اور پھر ہمیشہ کے لیے جلنے کو چھوڑ دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب کی دلیل سنی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انہیں حضور خداوندی میں پیش کریں۔

اللہ تعالیٰ کے کہنے پر فرشتوں نے حاجی صاحب کو گھسیٹنا بند کیا اور حضور حق میں لے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حاجی علی احمد کو اپنے سامنے پایا تو ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "کیا انہیں اپنی نمازوں، اپنے روزوں اور اپنے حجوں پر اتنا ناز ہے کہ وہ نار جہنم سے رہائی اور جنت میں جگہ پانے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔"

حاجی صاحب نے اللہ تعالیٰ کا سوال سنا تو نہایت عاجزی وانکساری سے جواب دیا کہ "انہیں اپنی عبادات پر ناز نہیں رحمت خداوندی پر بھروسہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ کو حاجی صاحب کا جواب پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب سے کہا: "یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے پانچ کی بجائے سات نمازیں پڑھیں، ایک حج کی بجائے سات حج کئے، تیس فرضی روزوں کے علاوہ ہر رمضان کے بعد سات نفلی روزے رکھے لیکن کیا انہوں نے کوئی ایسا کام کیا جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچا ہو۔"

حاجی صاحب نے اپنی ساری زندگی پر نظر ڈالی لیکن انہیں کوئی ایسا کام نظر نہ آیا جس کے بارے میں وہ کہہ سکتے کہ وہ کام انہوں نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کیا تھا۔ جب انہیں اپنی پوری زندگی میں کوئی ایسا کام دکھائی نہ دیا تو خدا کے سامنے شرمندگی کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب کے

اظہار شرمندگی کو قبول کیا پھر پوچھا: "کیا انہوں نے ساری زندگی کبھی کوئی ایسا کام کیا جس سے کسی درندے، چرندے، پرندے یا حشرات الارض میں سے کسی کو فائدہ پہنچا ہو۔"

حاجی صاحب نے پھر اپنی ساری زندگی پر نظریں دوڑائیں لیکن انہیں کوئی ایسا کام دکھائی نہ دیا جسے وہ حضور خداوندی میں پیش کرسکتے۔ چنانچہ پھر انہوں نے حضور حق میں پشیمانی کا اظہار کیا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے کمال فضل و کرم سے قبول کیا۔

لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب سے پوچھا: "چلو بنی نوع انسان کو بھول جاؤ، درندوں، چرندوں اور پرندوں کو بھول جاؤ، حشرات الارض کو بھی بھلا ڈالو، لیکن یہ بتاؤ کبھی تم نے اپنے ساتھ کوئی بھلائی کی؟ آخر تمہارے جسم کے بھی تم پر کچھ حقوق تھے کیا تم نے ان کا خیال رکھا۔"

اللہ تعالیٰ کے استفہام پر حاجی صاحب نے پھر اپنے شب و روز کا از سر نو جائزہ لیا۔ انہیں اندازہ ہوا کہ انہوں نے شوق عبادت میں اپنے جسم کے ساتھ کتنی زیادتی کی تھی۔ کس طرح اسے نیند سے محروم رکھا، کیسے اسے بھوکا پیاسا رکھا، کیسے اس کی جائز ضروریات کو پورا نہیں کیا۔

حاجی صاحب نے پھر خدا سے معذرت چاہی لیکن اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب کی معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حاجی صاحب کو لے جائیں اور جہنم رسید کریں کیونکہ جو انسان بنی نوع انسان، درندوں، چرندوں، پرندوں، حشرات الارض کے حقوق تو کجا اپنے جسم کے حقوق ادا نہ کر سکے اس کے لیے مناسب تریں ٹھکانہ جہنم ہے۔

حکم خداوندی سننے کے بعد حاجی علی احمد نے پھر رونا دھونا شروع کیا۔ فرشتوں نے انہی دوبارہ داڑھی سے پکڑا اور جہنم کے طرف گھسیٹنا شروع کیا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ حاجی علی احمد کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ان کی بیوی ان پر جھکی ان کو ڈراؤنے خواب سے جگانے کوشش کر رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی انہوں نے بیوی سے پوچھا باقی چھ کہاں ہیں؟

بیوی نے پوچھا باقی چھ کون۔ کہنے لگے باقی چھ بیویاں۔ بیوی نے جوتی پکڑی اور حاجی علی احمد کی پٹائی شروع کر دی۔

حاجی صاحب بہت چلائے کہ یہ خواب کی بات تھی۔ لیکن بیوی نے ایک نہ سنی اور ان کی خوب پٹائی کی۔ جب تھک گئی تو رونے دھونے اور وایلا کرنے لگی:

"وائے میری پھوٹی قسمت کہ حاجی صاحب نے میرے علاوہ چھ بیویاں کر رکھی ہیں اور مجھے ساری عمر خبر نہ ہوئی۔ اب اس بڑھاپے میں مجھے چھ سوتنوں کی خبر دے رہے ہیں۔"

حاجی صاحب نے بیوی کو سارا خواب سنایا تو اس نے حاجی صاحب سے معذرت چاہی کہ وہ صرف چھ بیویوں کے ذکر سے بھڑک اٹھی۔

حاجی صاحب نے بیوی کو تسلی دی اور کہا کہ آئندہ وہ نماز روزے کا اہتمام ضرور کریں گے لیکن اب بنی نوع انسان اور جانوروں کے حقوق کا ضرور خیال رکھیں گے کیونکہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ ان کے حقوق کا خیال رکھے بغیر عبادات کوئی مفہوم نہیں رکھتیں۔

مجسمہ

"کہاں جا رہے ہو؟"

"میں نہیں جانتا کہاں جا رہوں۔"

"اگر نہیں جانتے کہ کہاں جا رہے ہو تو چل کیوں رہے ہو۔"

"کیا میں چل رہا ہوں۔"

"مجھے تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ تم چل رہے ہو۔"

"یہ تمہاری نظر کا دھوکہ ہے کہ میں چل رہا ہوں۔ میں تو جامد و ساکت ایک جگہ کھڑا ہوں۔ میں پتھر کا مجسمہ ہوں۔ میں کیسے چل سکتا ہوں۔ کیا کبھی تم نے کسی مجسمے کو چلتے دیکھا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے کبھی کسی مجسمے کو چلتے نہیں دیکھا لیکن تم دنیا کے واحد مجسمے ہو جو ہمہ وقت چلتے رہتے ہو۔ اسی وجہ سے میں تمہیں پوچھ رہا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"پہلے تو میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ میں چل رہا ہوں۔ لیکن اگر تمہیں وہم ہے کہ میں چل رہا ہوں تو میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں کہیں نہیں جا رہا۔"

"خواتین و حضرات۔ مجھ پر چلنے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ میں ایک مجسمہ ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ مجسمے چلا نہیں کرتے۔ میں بھی یہی جانتا ہوں کہ مجسمے چلا نہیں کرتے۔ لیکن یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ یہ مجھ پر چلنے کا الزام لگا رہا ہے۔ یہ میری بات سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسے آپ سمجھائیں شاید یہ آپ کی بات سمجھ جائے۔"

لوگوں نے مسکرا کر مجسمے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ایک ہی سمت گھورے جا رہا تھا۔ کس طرف گھور رہا تھا اس کے بارے میں مجمع میں موجود لوگوں میں اختلاف تھا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ آسمان کی طرف

گھورتا رہتا ہے۔ دن کے وقت سورج کی طرف گھورتا ہے۔ رات ہوتی ہے تو چاند تاروں کو گھورنے لگتا ہے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی نظریں افق پر ٹکی ہیں۔"

ابھی لوگ یہ گفتگو کر رہے تھے کہ ایک بار پھر مجسمے کے سامنے کھڑے شخص کا مجسمے کے ساتھ مکالمہ شروع ہو گیا۔

"دیکھو۔ تمیں مجھے بتانا ہو گا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔"

"اچھا اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میں چل رہا ہوں اور کہیں جا رہا ہوں۔ تو تم مجھے بتاؤ تم نے مجھے کل کہاں دیکھا تھا۔ کیا میں آج اسی جگہ ایستادہ نہیں ہوں جہاں کل تم مجھے چھوڑ گئے تھے ؟"

"ہاں یہی تمہارا کمال ہے۔ تم ایک جگہ کھڑے رہتے ہو لیکن پھر بھی چلتے رہتے ہو۔ میں ابھی تمہیں ثابت کر دیتا ہوں کہ تم ایک جگہ ایستادہ رہنے کے باوجود ہمہ وقت حرکت میں رہتے ہو۔"

"دیکھو۔ اب تم یہ نہیں کہنا کہ چونکہ میں زمین میں گڑا ہوں اور زمین چل رہی ہے۔ اس لیے میں بھی چل رہا ہوں۔ یہ بات تو کوئی پاگل بھی کہہ سکتا ہے کہ زمین اپنے گرد چل رہی ہے۔ ساتھ ساتھ سورج کے گرد چل رہی ہے۔ اس لیے میں بھی زمین کے ساتھ ساتھ دونوں سفر طے کر رہا ہوں۔ اپنے گرد اور سورج کے گرد۔ لیکن جیسے تم ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ جا سکتے ہو۔ میں اس طرح نہیں چل سکتا۔ لیکن میں تمہیں داستان سنا سکتا ہوں۔ اپنی داستان اپنے لوگوں کی داستان ان لڑکوں، لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کی داستان جن کے ساتھ میرا تعلق تھا۔ لیکن یہ داستان سننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"دیکھا۔ اب تم خود ماننے لگے ہو کہ تم چل رہے ہو۔ نہ صرف تم خود چل رہے ہو بلکہ اب اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانا چاہتے ہو۔"

"خواتین و حضرات۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہ مجھے پاگل کہہ رہا تھا۔ آپ لوگوں کو میرے پاگل پن پر گواہ بنا رہا تھا۔ اب خود، تمہارے سامنے اقرار کر رہا ہے کہ یہ مجھے اپنے لوگوں سے ملوانا چاہتا ہے۔ ان لڑکوں،

لڑکیوں، عورتوں اور مردوں سے ملوانا چاہتا ہے جنہیں یہ اپنے لوگ کہتا ہے۔ اس لیے بظاہر یہ کھڑا رہتا ہے لیکن سچ یہی ہے کہ یہ چلتا رہتا ہے۔ یہ کبھی کھڑا نہیں ہوتا۔"

لوگوں کو مجسمے سے مخاطب شخص سے ہمدردی ہونے لگی۔ وہ مسلسل اس کے ساتھ مکالمہ کر رہا تھا۔ کبھی غیر بن کر مجسمے سے گفتگو کرتا اور کبھی مجسمہ بن کر خود ہی مجسمے کی طرف سے اپنے سوالوں کا جواب دیتا۔ سڑک پر چلتے لوگ حیرت سے مجسمے کے ساتھ اس کی گفتگو سن رہے تھے۔

"اچھا تو بتاؤ مجھے اپنے لوگوں کے بارے میں۔ ان لڑکوں، لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کے بارے میں جنہیں تم اپنا کہتے ہو۔ کون تھے تمہارے اپنے۔"

"وہ بہت پر امن لوگ تھے۔ دیکھو یہ سامنے تمہیں ایک سادہ سی عمارت نظر آ رہی ہے۔ ٹاٹ پر بیٹھے بچے پڑھائی کر رہے ہیں۔ یہ سب میرے کلاس فیلو ہیں۔ اور وہ بوڑھا ماسٹر، ماسٹر نور دین، میرا استاد ہے۔ کتنی محبت تھی ماسٹر نور دین کو اپنے ننھے منے طالب علموں کے ساتھ۔ کس محبت سے وہ ہمیں پڑھاتا تھا۔ کیا کیا کہانیاں سناتا تھا۔

ماسٹر نور دین کا کہنا تھا کہ سب کہانیاں سچ ہوتی ہیں۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں۔ گل وبلبل کے قصے۔ صحراؤں میں بھٹکتے شہزادوں اور شہروں کی فصیل پر کھلنے والی کھڑکیوں میں کھڑی ان کی منتظر شہزادیوں کی کہانیاں۔

کوئی کہانی جھوٹی نہیں ہوتی۔ چاہے بظاہر اس کی کوئی تک نہ ہو۔ لیکن اگر اس کی کڑیاں ملا دی جائیں تو ان کا سچ بادلوں میں چھپے سورج کی طرح رفتہ رفتہ عیاں ہونے لگتا ہے۔"

"اچھا ماسٹر نور دین کو چھوڑو مجھے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں بتاؤ۔ تمہاری ماں کون تھی۔ تمہارا باپ کون تھا۔ تمہارے کتنے بہن بھائی تھے۔ وہ سب کیا ہوئے۔"

"خواتین و حضرات۔ دیکھیں یہ مجھے میرا ماضی یاد دلانا چاہتا ہے۔ یہ مجھ سے اس آگ کے دریا کی داستان سننا چاہتا ہے جس سے میرے ماں باپ گذرے تھے۔ بہن بھائی گزرے تھے۔ اور میں خود گزرا تھا۔

میں پتھر کا مجسمہ ہوں۔ میرا اماں باپ اور بہن بھائیوں سے کیا تعلق۔ میں اپنی جگہ ایستادہ آتے جاتے زمانوں کی آہٹ سنتا رہتا ہوں۔ ہمہ وقت یہیں کھڑا رہتا ہوں۔ آپ جس وقت بھی یہاں سے گزریں مجھے آپ یہیں کھڑا دیکھتے ہیں۔ کبھی یہ مجھ پر چلنے کا الزام لگاتا ہے۔ کبھی یہ مجھ سے میرے خاندان کے بارے میں پوچھتا ہے۔ عجیب پاگل آدمی ہے۔ بھلا مجسموں سے بھی کوئی ایسے سوال کرتا ہے۔"

"ہاں ہاں مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ اپنے ماں باپ کے بارے میں بتاؤ۔ اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتاؤ۔"

"ہاں پہاڑ کی ڈھلوان پر درختوں میں گھرا جو گھر دیکھ رہے ہو۔ یہی ہمارا گھر تھا۔ اسی گھر میں میں نے آنکھ کھولی تھی۔

"میری ماں اور میرا باپ پہاڑی لوگ تھے۔ وہ دیکھو۔ ابھی تم ان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ ابھی آ گئے ہیں۔ وہ میرے دونوں بڑے بھائی۔ صحن میں کھیل رہے ہیں۔ اور وہ میری بہن جو میرے دو بڑے بھائیوں سے چھوٹی لیکن مجھ سے بڑی تھی کیسے چولہا چوکا چڑھانے میں میری ماں کی مدد کر رہی ہے۔ وہ کتنی چھوٹی ہے لیکن بڑی عورتوں کی طرح میری ماں کی مدد کر رہی ہے۔"

"دیکھو دیکھو تم نے پھر چلنا شروع کر دیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ تم پتھر کے مجسمے ہو اور اپنی جگہ ایستادہ رہتے ہو۔ لیکن میں مسلسل دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک جگہ نہیں ٹکتے۔ جب سے میں تم سے بات کر رہا ہوں تم مسلسل چلے جا رہے ہو۔ حرکت کر رہے ہو۔"

پھر اس نے لوگوں کی طرف رخ کیا اور کہنے لگا:

"خواتین و حضرات۔ یہ کہتا ہے کہ یہ چلتا نہیں۔ ابھی اس نے مجھے اپنا پرائمری اسکول دکھایا ہے۔ اپنے پہاڑی ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملایا ہے اور اب بھی یہ کہتا ہے کہ یہ اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ کیا آپ اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار ہیں کہ یہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔ آپ اس کی بات پر یقین کریں لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں۔ یہ مجھے اپنے ساتھ ماسٹر نور دین کے پاس لے کر گیا۔ پھر پہاڑ کی

ڈھلوان پر درختوں کے جھنڈ میں واقع اپنے گھر لے کر گیا۔ اس کے باوجود یہ کہتا ہے یہ یہیں کھڑا رہتا ہے۔"

"اچھا تو تم مجھے اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اپنی ماں باپ اور بھائیوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ آگے کیا ہوا۔"

"ایک دن میں اسکول گیا تو نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک زمین کانپنے لگی۔ میں باہر کھلے میدان میں کھڑا تھا۔ کہ اسکول کی عمارت زمیں بوس ہو گئی۔ ماسٹر نور دین اور میرے سارے کلاس فیلو عمارت کے نیچے دب گئے۔ اب وہ سب کہاں ہیں میں نہیں جانتا۔

میں نے گھر آنے کے لیے پہاڑی راستے پر چلنا چاہا لیکن پتھروں نے راستہ مسدود کر دیا تھا۔ کسی طرح انہی پتھروں پر چل کر میں اس جگہ پہنچا جہاں ہمارا گھر ہوتا تھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ گھر، نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی۔"

"خواتین و حضرات: میں نے اپنی ساری کہانی سنا دی ہے۔ اب میں ایک مجسمے کی طرح یہاں کھڑا ہوں۔ آپ روز یہاں سے گزرتے ہیں۔ کیا آپ نے مجھے کبھی یہاں سے کہیں آتے جاتے دیکھا ہے۔ لیکن یہ پاگل آدمی مجھے ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں ہمہ وقت حرکت میں رہتا ہوں۔ یہ ہر وقت مجھے ایک ہی سوال پوچھتا ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ خوب جانتا ہے کہ میں کہیں نہیں جا رہا۔ کبھی مجسمے بھی کہیں چلا کرتے ہیں۔؟"

"دیکھو، دیکھو تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے تمیں اپنی آنکھوں سے چلتے دیکھا ہے۔ لیکن تم مجھے بتانا نہیں چاہتے کہ تم کہاں جا رہے۔"

یہ کہہ کر اس نے مجسمے کے گلے میں باہیں ڈالیں اور رونے لگا۔

"میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔ دیکھو تم پھر چلنے لگے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

اجنبی

روبینہ کی شادی ہوئی تو اسے لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ ہار پہنے، سہرے سجائے، سفید گھوڑے پر سوار حقیقت کا روپ دھار کر اس کی زندگی میں چلا آیا ہے۔

شادی کے بعد آسماں تلے اگر کوئی اس کی توجہ کا مرکز تھا تو صرف اس کا خاوند اعجاز احمد۔ باپ نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹیاں باپ کے گھر سے سرخ جوڑے میں خاوند کے گھر جاتی ہیں اور سفید کفن میں وہاں سے نکلتی ہیں۔

روبینہ کے بابا نے رخصتی کے وقت روتے ہوئے یہ بات اس طرح کہی تھی کہ ان کے الفاظ اس کے سینے میں قبر کے کتبے پر کھدے لفظوں کے طرح ہمیشہ کے لیے کندہ ہو گئے تھے۔

شادی کے چند ماہ تک اعجاز کا روبینہ کے ساتھ رویہ بہت محبت آمیز تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ باہر گھمانے پھرانے لے جاتا۔ جب بھی دفتر سے چھٹی ہوتی اسے ساتھ لے کر کبھی باغوں اور کبھی ساحل سمندر کی سیر کو نکل جاتا۔ شاپنگ کراتا اور شہر کے اچھے ریستورانوں میں کھانا کھلاتا۔

لیکن رفتہ رفتہ بچوں کی پیدائش کے بعد شادی اعجاز کے لیے روزمرہ کا ایک واقعہ بن گئی۔ اس کی توجہ گھر سے زیادہ باہر کے معاملات پر مرکوز رہنے لگی۔ روبینہ اس کے لیے ایک ثانوی چیز بن گئی۔

یہ نہیں کہ اعجاز ایک برا آدمی تھا۔ یا اس کے شادی سے باہر کسی اور عورت کے ساتھ تعلقات تھے۔ بس اسے مجلسی زندگی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ دوستوں کے ساتھ بیٹھنا، گپ شپ کرنا، تاش اور کیرم کھیلنا اسے اچھا لگتا تھا۔

اعجاز کی بڑھتی ہوئی بے اعتنائی اور عدم توجہ سے روبینہ کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ وہ بہت کوشش کرتی کہ بچوں کے ساتھ اپنے آپ کو مصروف رکھے لیکن دن بھر کی اس مصروفیت میں بھی

ایسے چند لمحے ضرور آتے جب اس کا دل اداس ہو جاتا۔ وہ اپنی شادی سے پہلے کی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع ہو جاتی۔

شادی سے پہلے کی زندگی میں سے اسے ایک دن ہمیشہ یاد رہا۔ وہ کبھی اس دن کو نہ بھلا سکی۔ اس دن کا خیال آتے ہی اس کی اداسی ایک مسکراہٹ میں بدل جاتی۔ اس کے بچے اس کے چہرے پر ساون بھادوں کی دھوپ کی طرح ابھرتی اور ڈوبتی مسکراہٹ کا سبب پوچھتے تو وہ انہیں ششکار دیتی۔ اور پھر روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔

وقت کے ساتھ اعجاز احمد کی مجلسی مصروفیات اور زیادہ بڑھتی چلی گئیں۔ روبینہ اور بچے زندگی کی ڈگر پر چلتے ایسے مقام تک آ پہنچے جہاں سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے۔ بچے پڑھ لکھ کر جوان ہوئے اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

زندگی اتنی تیزی سے گزری کہ اعجاز احمد کی بے اعتناعی سے پیدا ہونے والے خلا کے باوجود روبینہ سمجھتی کہ اس نے ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے تمام فرائض پوری دیانت داری کے ساتھ پورے کر دیئے ہیں۔ اعجاز احمد کے خاوند ہونے کی حیثیت سے جتنے حقوق تھے سب پورے کئے۔ بچوں کی جیسی پرورش کرنی چاہیئے تھی کی۔ انہیں محبت سے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، جوان کیا اور اچھے انسان بنایا۔ یہاں تک کہ وہ سب اپنی اپنی جگہ سیٹ ہو گئے۔ وہ سب بھی روبینہ کا بہت خیال رکھتے۔

روزانہ اسے گھمانے پھرانے لے جاتے۔ کبھی ساحل سمندر پر چلے جاتے۔ کبھی شہر کے معروف ریستورانوں میں ڈنر کے لیے جاتے۔ کبھی کسی گارڈن میں پھولوں کی نمائش دکھانے لے جاتے۔ ایسے میں کبھی اعجاز احمد ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کہیں اور مصروف ہوتے۔

اگر اعجاز ان کے ساتھ ہوتے روبینہ کی پوری توجہ ان پر مرکوز ہوتی اور اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو وہ ان کی عدم موجودگی میں ان کی کمی محسوس کرتی۔

اس ڈگر پر چلتے چلتے زندگی ایسے موڑ پر آگئی جہاں انسان سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہو جاتا ہے۔ بھری مجلسوں میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ تب اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ایک بار انہی راہوں پر لوٹ جائے جہاں کبھی اس نے زندگی کا کوئی ایسا رنگ دیکھا تھا جو ہمیشہ کے لیے اس کے دل میں چراغ بن کر جل اٹھتا ہے اور پھر ساری عمر جلتا رہتا ہے یہاں تک کہ انسان کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔

کچھ ایسے ہی حالات میں، ایک روشن صبح، دن چڑھے، روبینہ نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے، سر پر چادر اوڑھی اور جوتے پہن کر اکیلے گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ بچوں نے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔ پھر کہنے لگے کہ وہ جہاں بھی جانا چاہے وہ اسے لے جانے کے لیے تیار ہیں لیکن روبینہ نے محبت سے ان سب کی مدد ٹھکراتے ہوئے جواب دیا کہ وہ اکیلے جانا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اکیلی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

گھر سے باہر کا ماحول اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ کئی بار اس راستے پر سفر کر چکی تھی۔ وہی دکانیں، ویسی ہی لوگوں کی آمد و رفت، وہی بجلی کے کھمبے، وہی آوارہ کتے، اور وہی بدروؤں میں سے باہر بہتا پانی۔

چلتے چلتے تھکاوٹ کی وجہ سے وہ کئی بار رکی، تھوڑی دیر سانس لیا، اور پھر چل پڑی۔ یہاں تک کہ وہ چلتے چلتے اپنے ہائی اسکول سے تھوڑی دور واقع بچوں کے ایک پارک کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ پارک میں اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہاں نصب لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت دیر تک اس بنچ پر بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔

کئی پہر تک وہاں بیٹھنے اور خلا میں گھورنے کے بعد وہ اٹھی۔ بنچ کے پاس ہی اگے گلاب کے ایک پودے سے ایک پھول توڑا، اور اسے ہاتھ میں تھامے گھر کی طرف چل دی۔

وہ گھر لوٹی تو دن ڈھل چکا تھا اور تقریباً اندھیرا چھا چکا تھا۔ بچوں نے کھانے پینے کے بارے میں پوچھا تو اس نے طبعیت نہ ٹھیک ہونے کا کہہ کر کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ پھر بچوں سے چند باتیں کر کے اپنے کمرے میں جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس نے آنکھیں موند لیں۔

اگلی صبح اس کے بچوں نے دیکھا گلاب کا ایک پھول اس کی چھاتی پر رکھا تھا، اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ پھیلی تھی اور وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ لگتا تھا وہ اب بھی کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن کس کا یہ کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا۔

دستخط

علی اکبر نے بی اے کیا تو اس کے والد نے اس کے مستقبل کے عزائم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچے وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ملکوں ملکوں گھومنا پھرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کرنا چاہتا ہے کہ اسے زندگی میں کیا کرنا ہے۔

ملک اکبر نے بیٹے کی بات سنی تو ہنس کر کہنے لگے " ان کی بہت خواہش تھی کہ وہ پاکستان سے باہر سفر کرتے، ہر ملک کی سیر کرتے، لیکن زندگی نے انہیں فرصت دی تو صرف اتنی کہ ایک بار وہ سعودی عرب حج کے لیے گئے اس کے علاوہ انہیں کہیں جانے کا موقع نہیں ملا۔ انہیں خوشی ہو گی اگر ان کا بیٹا ملکوں ملکوں جائے۔ ہر ملک کے لوگوں سے ملے۔ ہر کلچر کا مشاہدہ کرے اور پھر پاکستان میں سیٹل ہو۔"

علی اکبر نے باپ کی بات سنی تو اسے حوصلہ ملا۔ چنانچہ اس نے اگلے ہفتے چند ہزار روپے جیب میں ڈالے اور بذریعہ کابل یورپ کی طرف روانہ ہو گیا۔

لاہور، پشاور، کابل، زاہدان، تہران، انقرہ اور استنبول ہوتے ہوئے اورینٹل ایکسپرس پر وہ پیرس پہنچا تو اسے لگا کہ وہ دنیا کے کلچرل سنٹر میں پہنچ گیا ہے۔

چند دن پیرس میں گزارنے کے بعد وہ لندن چلا آیا۔ لندن میں اس کے جاننے والے کئی پاکستان رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے اسے کشادہ دل اور کھلے بازوؤں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ سب کی خواہش تھی کہ علی اکبر لندن میں رک جائے اور باقی زندگی وہیں گزارے۔ لیکن چند دن لندن کے گلی کوچوں میں آوارگی کرنے کے بعد اس نے امریکہ کا ٹکٹ خریدا اور جہاز پر بیٹھ کر نیویاک پہنچ گیا۔

نیویارک اسے پیرس اور لندن سے مختلف لگا۔ بطور شہر نیویارک کی شخصیت اسے اس اوور کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس شخص جیسی لگی جس نے اپنا سب کچھ اپنے اوور کوٹ کے نیچے چھپا رکھا ہو۔ اس کی پھٹی پرانی پینٹ، مختلف رنگوں کی جرابیں، میلی کچیلی شرٹ سب کچھ اس اوور کوٹ کے نیچے چھپا تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود نیویارک میں ایک ایسا حسن تھا جو لندن اور پیرس میں نہیں تھا۔ یہ حسن اس سوئی ہوئی حسینہ سے مشابہہ تھا جو سوتے میں بھی اپنے حسن کے بارے میں باخبر رہتی ہے۔ اور اپنے طرف بڑھنے والے کسی بھی آشنا کے ہاتھ کو پہلے جھٹکتی ہے پھر اسے تھام لیتی ہے۔

چند دن نیویارک میں گزارنے کے بعد علی اکبر نے ایک عدد گاڑی خریدی اور یو ایس کے ٹرپ پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس ملک کو اندر باہر سے اچھی طرح دیکھے اور جانے۔

امریکہ میں وہ شہروں شہروں گھومتا پھرتا سان فرانسسکو پہنچا تو اسے محسوس ہوا یہی وہ شہر تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سان فرانسسکو میں ہمیشہ کے لیے قیام کرے گا۔ یہیں اپنی باقی تعلیم پوری کرے گا۔ گھر بنائے گا، شادی کرے گا اور بچے پیدا کرے گا۔

اس فیصلے کے بعد اس نے سسان فرانسسکو میں پہلے تعلیمی مواقع کا جائزہ لیا۔ پھر ایک اپارٹمنٹ رینٹ کیا اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

رہائش کا فیصلہ اور اہتمام کرنے کے بعد اس نے اسکول میں ایم بی اے میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی ایک امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کی بنیاد رکھی۔ جب تک اس نے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ اس کی کمپنی پہلے ہی لاکھوں ڈالرز ماہانہ کا بزنس کر رہی تھی۔ کاروبار کی وجہ سے اسے اکثر چین، جاپان، پاکستان اور کئی ایک دیگر ممالک کا سفر کرنا پڑتا۔

وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھا۔ ایک طرف اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور دوسری طرف امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار سیٹ ہو چکا تھا۔

ان کامیابیوں کے بعد سان فرانسسکو ہی میں اسے ایک خوبصورت، نیک دل، نیک سیرت پاکستانی لڑکی مل گئی جس کے ساتھ اس نے شادی کر لی۔

شادی ہوئی تو بچے بھی پیدا ہونے تھے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ان کے ہاں پانچ بچے پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد اس نے اور اس کی بیوی نے اس طرح بچوں کی تربیت کی کہ وہ پاکستانی ماحول میں

پاکستانیوں کی طرح اور امریکی ماحول میں امریکیوں کی طرح فٹ ہو جاتے۔ انہیں نہ پاکستانیوں میں اور نہ امریکیوں میں اجنبیت کا احساس ہوتا۔

علی اکبر اپنی ان کامیابیوں پر بہت خوش تھا۔ جب وہ امریکہ آیا تھا اس نے ابھی جوانی کی دہلیز میں قدم رکھا تھا۔

لیکن امریکہ میں پڑھائی لکھائی، کاروبار، شادی، بچوں اور بچوں کی تربیت میں زندگی اتنی تیزی سے گزری کہ اسے اپنے باپ سے بی اے پاس کرنے کے بعد کی گئی گفتگو گذشتہ کل کی بات محسوس ہوتی۔ اس کی جوانی ادھیڑ عمر، اور ادھیڑ عمر بڑھاپے میں اتنی تیزی کے ساتھ ڈھلی کہ اسے عمر گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

اس دوران پاکستان میں اس کے ماں باپ فوت ہوئے، پھر بہن بھائی اور ایک ایک کر کے کئی ایک رشتے دار فوت ہوئے۔

شہر میں اس کے سارے خاندان کی قبریں ایک جگہ تھیں۔ اس کا پردادا، پردادی، دادا، دادی، والدین، بہن بھائی اور دوسرے عزیزواقارب کی قبریں ایک جگہ تھیں۔

اب وہ زندگی کے طویل سفر کے بعد خود عمر کے اس حصے میں آپہنچا تھا جہاں انسان زندگی کے آخری لمحوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ خاص طور پر جب بہن بھائی فوت ہو جائیں تو پھر انسان اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

بچوں نے جوان ہونے کے بعد علی اکبر کا کاروبار سنبھال لیا تھا اور اب وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ صبح اٹھ کر اخبار پڑھتا، ناشتہ کرتا، ٹی وی دیکھتا اور پھر طویل سیر کے لیے باہر نکل جاتا۔ کبھی کبھار اس کی بیوی اس کے ساتھ ہو لیتی۔ اگر کسی وجہ سے اس کی بیوی ساتھ جانے سے معذرت کرتی تو وہ اکیلا سیر کے لیے نکل کھڑا ہوتا۔

جب کبھی وہ اور اس کی بیوی اکٹھے سیر کے لیے جاتے ان کی اپنی زندگی کی آخری رسومات کے بارے میں بات چل نکلتی۔

اس کی بیوی کا خیال تھا کہ وہ اس سے پہلے فوت ہوگی۔ لیکن علی اکبر کا خیال تھا کہ پہلے وہ فوت ہو گا۔ پہلے میں پہلے میں کے بعد وہ اکثر سوچتے کہ انہیں پاکستان میں دفن ہونا چاہیے یا امریکہ میں؟ اس کی بیوی کا خیال تھا کہ چونکہ ان کے خاندان کے سارے افراد پاکستان میں دفن ہیں اس لیے انہیں وہیں دفن ہونا چاہیئے۔ علی اکبر اس بارے میں رائے دینے سے گریز کرتا۔ کہتا بھی تو اتنا کہ یہ کام بچوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ جو وہ فیصلہ کریں گے ٹھیک ہو گا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن علی اکبر کی طبعیت اچانک بگڑ گئی۔ ایمبولینس آئی۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ انہیں ہسپتال آتے کافی دیر ہو چکی ہے۔ انہیں بلڈ کینسر ہے۔ اور وہ زیادہ دن نہیں جی پائیں گے۔ اس خبر سے اس کی بیوی اور بچوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن انہوں نے رخ پھیر کر آنسو صاف کئے تا کہ علی اکبر انہیں دیکھ نہ پائے۔

لیکن علی اکبر نے ان کے آنسو دیکھ لیئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو تسلی دیتے ہوئے بولے۔ زندگی اور موت ایک ہی پیالے سے پانی پیتے ہیں۔ جس طرح زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح موت بھی ایک حقیقت ہے۔ پھر بیوی سے بولے "انہیں افسوس ہے کہ وہ اس سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور پھر کہنے لگے۔ انہوں نے اپنی آخری رسومات کے بارے میں کپڑوں کی الماری میں ایک لفافے میں ہدایات لکھ رکھی ہیں۔ اگر ہو سکے تو ان پر عمل کیا جائے۔"

علی اکبر نے اتنا کہا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ہسپتال والوں نے اس کے مردہ جسم کو ہسپتال کے فریزر میں رکھوا دیا۔

بیوی اور بچے روتے ہوئے گھر آئے۔ بیوی نے کپڑوں کی الماری میں دیکھا تو وہاں واقعتاً ایک لفافہ رکھا تھا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک سفید کاغذ نکلا جس پر لکھا تھا:

"یو ایس اے میرا ملک ہے۔ مجھے اس ملک سے محبت ہے۔ اگر میں کسی دوسرے ملک میں فوت ہو جاؤں تو میرے مردہ جسم کو یہاں واپس لایا جائے اور یہاں رولنگ ہلز قبرستان میں دفنایا جائے۔ میری پیدائش پاکستان میں ہوئی تھی لیکن امریکہ نے مجھے اتنی محبت دی کہ میں چاہتا ہوں میرا جسم مرنے کے بعد اس مٹی کا حصہ بنے۔"

علی اکبر کی تحریر دیکھ کر اس کی بیوی کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ پھر وہ بچوں کے ساتھ رولنگ ہلز قبرستان گئی۔ وہاں دفتر میں قبر کے لیے فارم بھرا تو ایک کی بجائے دو قبروں کا خانہ بھرا۔ بچوں نے بغیر سوال کئے استفہامیہ انداز میں دو قبروں کے بارے میں پوچھا تو تر آنکھوں کے ساتھ کہنے لگی:

"جہاں علی اکبر وہیں میں۔ اگر وہ یہاں دفن ہونا چاہتا ہے۔ تو میں بھی یہیں دفن ہوں گی۔ امریکہ صرف علی اکبر کا ہی نہیں میرا بھی ملک ہے۔ اور تمہارا بھی اور تمہاری آئندہ نسلوں کا بھی۔" اور پھر اس نے فارم پر دستخط کر دیئے۔

اور خدا خوشی سے رو پڑا

جہاں تک نظریں کام کرتی تھیں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ فطرت مکمل طور پر بپھری ہوئی تھی۔ پانی ہر طرف سے اُبلا چلا آرہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے پہاڑ اُبل پڑے ہیں اور بلندیوں سے اُچھلتے پانی کے ریلے ہنستی بستی بستیوں، کھیتوں، کھلیانوں، درختوں، مویشیوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کو بہالے جانا چاہتے ہیں۔

آناً فاناً کروڑوں لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ ان کے سر پر چھتیں نہیں، سونے کے لیے چارپائیاں نہیں، کھانے کے لیے روٹی نہیں، پہننے کے لیے کپڑے نہیں، اور اتنے پانی کے درمیان پینے کے لیے پانی نہیں۔ وہ کروڑوں انسانوں کی تباہی اور بربادی پر پریشان ہے۔ وہ ان کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ اس کے بندے اور بندیاں ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مر رہے ہیں، مٹ رہے ہیں، تباہ وبرباد ہو رہے ہیں لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ فرشتوں سے ناراض ہے۔ چیخ چیخ کر انہیں احکامات دے رہا ہے۔ جاؤ جاؤ اُس کی مدد کرو، اِس کی مدد کرو، اُسے بچاؤ، اِسے بچاؤ۔ فرشتے بھی پریشان ہیں۔ اتنی بڑی تباہی اور بربادی سے دوچار لوگوں کی مدد کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لیکن خدا کی چیخ وپکار پر وہ بھی بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ جس کی جتنی مدد ہو سکتی ہیں کر رہے ہیں۔

خدا ان سب کو دیکھ رہا ہے جو اس مصیبت سے دوچار ہیں۔ وہ انہیں بھی دیکھ رہا ہے جو اس وقت ان لوگوں پر مسلط ہیں۔ ان کا مسخرہ پن دیکھ کر اسے افسوس ہو رہا ہے۔

وہ فرشتوں سے پوچھتا ہے۔ یہ سب بدصورت لوگ کون ہیں۔ کوئی لندن جا رہا ہے تاکہ ان کروڑوں انسانوں کی تباہی و بربادی کے باوجود اپنے پینٹ ہاؤس کی ڈیل کی تکمیل کر سکے۔ کوئی اپنے سوٹ، نکٹائیاں، اور جوتے نیلام کرنا چاہتا ہے، تاکہ ان کروڑوں لوگوں کی مصیبت کا مذاق اڑا سکے، کوئی

تصویریں کھنچوانے کے لیے میڈیا کی ٹیمیں ساتھ لیکر ہیلی کاپٹروں اور گاڑیوں میں مارامارا پھر رہا ہے تا کہ لوگ دیکھ لیں کہ وہ کتنا ذمہ دار حکمران ہے۔ کوئی لندن میں بیٹھ کر تقریریں کر رہا ہے۔ کوئی ان مصیبت کے مارے لوگوں کی مدد کے نام پر دنیا بھر میں پھیلے ہم وطنوں سے پیسے اکٹھے کر رہا ہے۔

فرشتے جواب دیتے ہیں کہ یہ پاکستان کے موجودہ اور متوقع حکمران ہیں۔ خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ ان سب مسخروں کے گلوں میں رسیاں ڈال کر ٹائٹ کر دو اور ان کے بارے میں میرے احکامات کا انتظار کرو۔ مجھے اپنے ان کروڑوں بے بس انسانوں کے مصائب سے فارغ ہو لینے دو جو پانی کے ریلوں میں بہہ رہے ہیں اور سیلاب کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ ان مسخروں کا کیا کرنا ہے۔

فرشتوں کے ساتھ اس گفتگو کے دوران اچانک خدا کو ایک طرف سے رونے دھونے اور گڑگڑانے کی آوازیں آتی ہیں۔ کچھ لوگ ہزاروں انسانوں کے ساتھ رو رو کر، گڑگڑا، گڑگڑا کر، دعائیں مانگ رہے ہیں۔

"اللہ اس آزمائش کو آزمائش ہی رہنے دینا اسے عذاب نہ بنانا۔ اللہ کروڑوں انسان بے گھر ہو گئے ہیں۔ ان کو دوبارہ گھر عطا کر۔ اللہ اللہ ہمارے گناہوں کو نہ دیکھ [خدا زیر لب مسکراتا ہے] اپنی رحمتوں کو دیکھ۔"

وہ رو رہے ہیں۔ گڑگڑا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہزاروں لوگ ہاتھ اٹھائے رو رہے ہیں۔ گڑگڑا رہے ہیں۔

خدا فرشتوں سے پوچھتا ہے یہ کون ہیں؟ فرشتے جواب دیتے ہیں۔ یہ علمائے دین اور ان کے پیروکار ہیں۔ یہ رو رو کر تمہاری توجہ پانی کے ریلوں میں پھنسے تمہارے کروڑوں تباہ حال انسانوں کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے۔ ان مسخروں کے گلوں میں بھی رسیاں ڈال کر ٹائٹ کر دو۔ اور ان کے بارے میں میرے احکامات کا انتظار کرو۔ میں نے ان ناخلفوں کو جس کام کے لیے پیدا کیا تھا یہ مجھ سے انہی کاموں کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

یہ جہلاء نہیں جانتے کہ میں پانی کے ریلوں میں پھنسے اپنے کروڑوں انسانوں کی حالت سے نہ صرف باخبر ہوں بلکہ ان کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مسخرے کروڑوں انسانوں کو مسلسل بے عملی کی دلدل میں دھکیل رہے ہیں۔ بجائے مصائب میں پھنسے انسانوں کی مدد کرنے کے نہ صرف اپنا وقت ضائع کر رہے بلکہ ان کروڑوں انسانوں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں جو رونے دھونے اور گڑ گڑانے کی بجائے عملاً ان بھائیوں، بہنوں اور بچوں کی مدد کر سکتے ہیں جنہیں اس وقت ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

ان رونے دھونے اور گڑ گڑانے والے بے عمل مسخروں سے دور خدا کو چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دکھائی دیتے ہیں جن کی پیشانیاں زندگی کے عزم سے چمک رہی ہیں وہ اپنی بساط کے مطابق پانی کے ریلوں میں پھنسے بے حال لوگوں کی جس طرح بن پڑ رہا ہے مدد کر رہے ہیں۔ کوئی ان لٹے پٹے لوگوں کو سنبھال رہا ہے۔ کوئِ انہیں حرف تسلی دے رہا ہے۔ کوئِ ان تک کھانا پہنچا رہا ہے۔ کوئی ان تک پانی پہنچا رہا ہے۔ کوئی انہیں بیماریوں سے بچنے کے لیے دوائیاں دے رہا ہے۔ کوئی ان کو جینے کی امید دلا رہا ہے۔ کوئی ان کے حوصلوں کو ٹوٹنے سے بچا رہا ہے۔

خدا ان عزم سے بھرپور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو مصروف عمل دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

فرشتے خدا کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔ اے الہٰ العالمین تمہاری آنکھوں میں آنسو؟

خدا فرشتوں سے کہتا ہے۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو پانی میں پھنسے میرے کروڑوں انسانوں کی مدد کر رہے یہ میری امید ہیں۔ یہی سچے اور کھرے انسان ہیں۔ جاؤ اور جا کر ان کی مدد کرو۔

خدا کا حکم ملتے ہی لاکھوں کروڑوں فرشتے آسمانوں سے اُڑتے ہیں اور زمین پر آکر ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے کام میں شامل ہو جاتے ہیں جو پانی کے ریلوں میں پھنسے ان بے بس انسانوں کی مدد کر رہے۔

کھڑکی سے باہر سورج

پھر یوں ہوا کہ میرے سارے وجود پر کیکٹس اُگ آئے۔ میں نے اپنے اوپر کمبل اوڑھ لیا اور آنکھیں موندھ کر لیٹ گیا۔

وہ کمبل سیاہی کی انت رات میں بدل گیا جس میں سے دو بڑی بڑی مونچھوں نے جنم لیا جن کے عقب سے ایک چہرہ مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔

میں ان شعلہ بار نظروں سے خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں یہ خفیہ والا تو نہیں۔ میرے ذہن میں خوف کے سائے سرسرانے لگے۔

اس نے مجھے خوف زدہ دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولا:

"تمہارا المیہ یہ ہے۔۔۔"

اس نے اچانک ایک کیکٹرا کہیں سے نکال کر مجھ پر پھینکا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:

"معاف کرنا میں نے یہ جملہ اس لیئے کہا ہے کہ آج کل تمام تنقیدی مضامین کا آغاز اسی جملے سے ہوتا ہے۔" اس کی بات سن کر میں بھی ہنس دیا۔

"ہاں میرا المیہ۔۔۔"

ابھی میں نے اتنا کہا تھا کہ اس نے میرا جملہ کاٹتے ہوئے مجھ سے پوچھا: "کیا تم نے کبھی عشق کیا ہے؟"

پھر اس نے لعل حسین پر مجھے پورا لیکچر پلا دیا۔

میرے اندر چھناکے سے لاکھوں گلاس ٹوٹ گئے۔

مجھے اپنا ایک طالب علم یاد آیا جس نے کلاس روم میں مجھ سے پوچھا تھا: "سر آزادی کا مفہوم کیا ہے؟"

میں نے بے دردی سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "بیٹھ جاؤ، اور آئندہ کلاس میں ایسا بیکار سوال مت کرنا۔"

پھر میں واشنگٹن چلا آیا۔

میرے چھوٹے بیٹے نے مجھے خط لکھا:

"ابو، اگر آپ کو وہاں وہ پنجرہ دکھائی دے، جس میں وہ طوطا قید ہے، جس میں اس دیو کی جان ہے، جس نے شہزادی کو قید کرر کھا ہے، تو اسے ضرور مار دیں تا کہ بے چاری شہزادی اس دیو کی قید سے رہا ہو سکے۔"

مجھے لگا یہ میرے بیٹے کی نہیں بلکہ اس کی ماں کی تحریر ہے۔

"تمہارا بیٹا تم سے زیادہ عقلمند دکھائی دیتا ہے۔" مونچھوں والے نے خط پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"تم فقط شہری بابو ہو۔ ننانوے لفظوں کے ہیر پھیر سے ساری گفتگو کرتے ہو۔ اگر میں تم سے ننانوے لفظ چھین لوں تو تم گونگے ہو جاؤ گے۔"

میں نے مونچھوں والے کی نظریں بچا کر اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے عین وقت پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم کیا لفظوں سے۔۔۔؟ پھر اس نے ایک اور کیکڑا مجھ پر پھینکا۔

میں نے اپنی تمام جسمانی قوت بروئے کار لاتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن میں اپنا جواب خود بھی نہ سن سکا۔ ننانوے لفظوں کی دیوار میرے اور اس کے بیچ حائل تھی۔ اس نے مجھے متذبذب دیکھ کر کہا:

"لفظ لمحہ موجود کو آواز بخشتا ہے۔"

"لمحہ موجود کی آواز۔۔۔؟"

میرے اندر حیرت و استعجاب کے لاکھوں قمقمے جل اٹھے۔

"ہاں لمحہ موجود کی آواز۔۔۔" بڑی مونچھوں والے نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ "لیکن تم نے اپنی دنیا کو صرف ننانوے لفظوں تک محدود کرر کھا ہے۔ ہر چیز کو ان ننانوے لفظوں میں دیکھتے، پرکھتے اور تولتے ہو۔ یہ ننانوے لفظ تمہارے اور لمحہ موجود کے درمیان ایک ایستادہ دیوار ہیں۔ جو تم تک لمحہ موجود کا پیغام

نہیں پہنچنے دیتے۔ کیونکہ اس سے خود ان کی موت واقع ہونے کا امکان ہے۔" مونچھوں والے نے اپنی بات جاری رکھی۔

اس کی بات سن کر میں نے اپنے اندر اس طرح جھانکا جیسے مجھے اندھیرے کمرے میں چھپے کسی چور کی تلاش ہو۔ پھر میں خود کو سنبھالتے ہوئے بولا:

"لیکن بھائی میں تو ایک پروفیسر آدمی ہوں۔ لفظوں سے میرا دانہ پانی چلتا ہے۔ میں لفظوں کے ہیر پھیر سے کیسے نکل سکتا ہوں؟"

میرے جواب پر اس نے بغیر کچھ کہے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی گر گیا۔ مجھے لگا میری چوری پکڑی گئی ہے۔

پھر اس نے رات کی تاریکی میں اونچی آواز میں بلھے شاہ کو گانا شروع کر دیا:

"راتیں جاگیں شیخ سداویں
تے راتیں جاگن کُتے
تیں تھی اُتے۔

پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے بلھے شاہ کو ادھورا چھوڑ کر مجھ پر ایک اور کیکڑا پھینکا:

"یہ جو تم سیاست کی بات کرتے ہو۔ تمہاری سیاست بھی ننانوے لفظوں کی سیاست ہے۔ تم زندہ رہنے کی سیاست نہیں کرتے۔"

"لفظوں کی سیاست۔۔۔"

لفظ میرے ہونٹوں پر کپکپائے۔ میں نے بے بس ہوتے ہوئے ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے میری بے بسی تاڑ گیا تھا۔

"لیکن اصل چکر تو وہ چلاتا ہے۔۔۔"

"وہ کون؟"

وہ جس کا نام تمہارے ہونٹوں تک آتے آتے کبوتر بن کر اُڑ جاتا ہے اور پولیس والے تم پر بندوقیں تان لیتے ہیں۔

وہ اپنی مونچھوں کو بل دینا شروع ہو گیا۔

میں نے دیکھا بہت سے پولیس والے بندوقیں تانے پھانسی کا پھندہ لہراتے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

میری پیشانی پسینے کے قطروں سے بھیگ گئی۔

بڑی بڑی مونچھوں والے نے میری پیشانی پر خوف سے تیرتے پسینے کے قطرے دیکھ کر قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

"میں نے کہا تھا ناں کتابیں پڑھنے والے ٹھوس سچائی کا سامنا نہیں کر سکتے۔"

"کیا تم سچائی کے نام پر پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ کروانا چاہتے ہو؟" میں غصے سے چیخنے لگا۔ مجھے ناراض دیکھ کر اس نے اپنی انگور کی طرح پکی ہوئی ناک کھجانا شروع کر دی۔

میں نے اس کو ناک کھجاتے دیکھ کر اس پر چڑھائی کر دی۔ "جانتے ہو تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم ہر چیز پر بغیر اس کا حصہ بنے تنقید کرنا چاہتے ہو۔ لیکن پھر بھی تم مجھے معقول آدمی دکھائی دیتے ہو۔ بولو چائے پیو گے؟ اس نے میری چائے کی پیشکش قبول کر لی۔

میں نے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھی تو وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر سیاہی مائل نیلگوں آسماں کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ ستاروں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوران چائے دم ہو گئی تو میں نے اسے دو پیالیوں میں انڈیل کر سامنے بچھی میز پر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر تک گرم گرم چائے سے اٹھتی بھاپ کے مرغولے دیکھتا رہا اور پھر چائے کی پیالی ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے بولا:

"کیا تم دیوار پر آویزاں وہ نقشہ دیکھ رہے ہو۔"

اس نے دیوار پر آویزاں نقشے کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تمیں اس میں نئ ابھرتی ہوئی لکیریں دکھائی دے رہی ہیں؟"
مونچھوں والے نے افسردہ اور دکھی لہجے میں مجھ سے کہا۔
"لیکن ان تبدیل ہوتی ہوئی لکیروں کے باوجود تمہیں یہیں رہنا ہے۔"
میں نے دیکھا آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور دور تک روشنی کی لکیر کھینچتا فضاؤں میں معدوم ہو گیا۔ میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔
"ہاں، ہاں، مجھے یہیں رہنا ہے۔"
میں نے دیکھا تب تک بڑی بڑی مونچھوں والا چائے ختم کر کے جا چکا تھا۔ میں نے دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میں نے دیکھا میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص نے سورج کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اس کے عقب میں بہت سے کبوتر فضا میں پرواز کر رہے تھے۔

خدا کے ساتھ ایک مکالمہ

میری توقع کے برعکس خدا نے مجھے بہت اچھے الفاظ میں خوش آمدید کہا۔

اس نے مجھ سے کوئی ایسا سوال نہ کیا جس کے بارے میں میں ساری عمر یہودی، نصرانی اور مسلمان علما سے سنتا چلا آیا تھا۔

مثال کے طور پر خدا نے مجھے بالکل نہیں پوچھا کہ میں یہودی ہوں یا نصرانی یا مسلمان۔ نہ ہی اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرے زمین پر قیام کے درمیان میرا اس پر اعتقاد تھا یا نہیں۔ اس نے مجھ سے کسی پیغمبر کے بارے میں بھی کوئی سوال نہ کیا۔

اس کے برعکس اس نے مجھے مبارک باد دی کہ میں ایک طویل سفر کے بعد گھر لوٹا ہوں۔

میں نے مبارک باد کی وجہ پوچھی تو خدا نے مجھے بتایا کہ بہت کم ہیں جو زندگی کے طویل سفر کے بعد گھر لوٹتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ جتنے لوگوں کو اس سفر پر بھجواتا ہے ان میں سے زیادہ تر راستے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی خرافات میں کھو جاتے ہیں کہ ان کی واپسی ناممکن ہو جاتی ہے اور ان میں سے زیادہ تر گرد و غبار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

"ان کے راستے میں ضائع ہونے کی وجہ کیا ہے"۔ میں نے خدا کو مہربان دیکھتے ہوئے اس سے سوال پوچھا۔

"وجہ کوئی خاص نہیں۔ وہ اتنا بوجھ اٹھا لیتے ہیں کہ ان کے لیے سفر جاری رکھنا ممکن نہیں رہتا اور وہ اس بوجھ تلے دب کر ہمیشہ کے لیے برباد ہو جاتے ہیں"۔

پھر خدا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"مثال کے طور پر یہ اعتقاد کہ میں ہوں یا نہیں ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ اس سوال کا بوجھ اٹھانے کی انہیں سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اتنی شد و مد سے میرے ہونے یا نہ ہونے کے سوال کا بوجھ

اٹھاتے ہیں کہ وہ اس کے نیچے دب کر ہکلانے لگتے ہیں۔ بعض اوقات تو بے چاروں کا اتنا برا حال ہوتا ہے کہ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے، وہ ایک دوسرے پر غرّانا شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ میرے لیے سب سے تکلیف دہ لمحہ وہی ہوتا ہے جب وہ میرے لیے ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے اقرار یا انکار سے مجھے رتی بھر فرق نہیں پڑتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود انہیں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن وہ یہ سب نہیں جانتے۔"

خدا مجھ سے یہ گفتگو کر رہا تھا اور میں اس کے چہرے پر ابھرتے اور ڈوبتے افکار کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گفتگو روک کر اچانک مجھے پوچھا کہ کیا مجھے کچھ پینے کی خواہش ہے؟

مجھے خدا کے اس سوال پر احساس ہوا کہ میں ایسی تمام خواہشات سے پاک ہو چکا ہوں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ نہ کوئی فکر تھا نہ غم۔ نہ کوئی حسرت تھی نہ تمنا۔ نہ کوئی خوف تھا نہ امید۔

میں نے جواباً خدا سے کہا کہ نہیں میں ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ بلکہ میں یہ تک نہیں جانتا کہ بھوک یا پیاس کیا ہوتی ہے؟

میرے جواب سے خدا خوش ہوا۔ اس کی خوشی اس کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھی۔ اس نے خوشی سے مغلوب جذبات سے مجھے پوچھا کہ مجھے گھر واپس لوٹنا کیسا لگ رہا ہے؟

میں نے جواب دیا کہ واپس لوٹنا اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن یکسانیت کچھ اچھی نہیں لگ رہی۔ تنوع کی عدم موجودگی کچھ کھٹکتی ہے۔ اگر منظر تبدیل ہوتے رہیں تو شاید یہ تجربہ زیادہ خوش گوار رہے۔

خدا نے میرے جواب پر دل چسپی سے سر کو حرکت دی اور کہا کہ پوری کوشش کی جائے گی کہ دارالبقا میں میرے قیام کو زیادہ سے زیادہ پر کشش بنایا جائے۔

پھر خدا نے مجھے کہا کہ اب تک مجھے جتنے سوال تنگ کرتے رہے ہیں اگر میں چاہوں تو اس سے وہ سب سوال ایک ایک کر کے پوچھ سکتا ہوں۔

خدا کا محبت بھرا اور آزادانہ برتاؤ دیکھ کر میری ڈھارس بندھی اور میں نے اسے پوچھا کہ اس نے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں لوگوں میں کنفیوزن کیوں پیدا کی ہے؟

خدا نے خندہ پیشانی سے میرا سوال سنا اور کہا کہ اس نے اپنے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کبھی کنفیوزن پیدا نہیں کی۔ زندگی کے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس نے انسان کو بہترین صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان تمام صلاحیتوں کا مرکز اس کے ذہن کو بنایا ہے۔ اس کے ذہن کی ساخت اس طرح کی ہے کہ وہ مسلسل انکار اور اقرار کے ذریعے اپنے ارد گرد کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہے۔ اسی انکار اور اقرار کی صلاحیت کے ذریعے وہ اکٹھی کی گئی معلومات کی تردید یا تصدیق کرتا ہے۔ کچھ انسان تردید کی سطح پر اٹک جاتے ہیں کچھ تصدیق کی۔ جو اپنا سفر جاری رکھتے ہیں وہ دارالبقا تک پہنچ جاتے ہیں۔ جو محض تردید یا تصدیق پر اٹک جاتے ہیں وہ راستے کے گرد و غبار میں ڈھل جاتے ہیں۔ تردید یا تصدیق میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ جو اس عمل کو جاری رکھتے ہیں وہ زندگی کے آخری لمحے تک چاہے تردید کے مرحلے میں ہوں یا تصدیق کے وہ کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ مقصد زندگی بھر سفر جاری رکھنا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب توضیح تھی جو خدا نے اپنے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دی تھی۔ میں نے کبھی کسی یہودی، نصرانی یا مسلمان عالم سے یہ توضیح نہیں سنی تھی۔

خدا کی اپنے ہونے نہ ہونے کے بارے میں یہ توضیح سن کر میں نے سوچا خدا اگلی بات پیغمبروں، ولیوں اور صوفیوں کے بارے میں کرے گا لیکن میری توقعات کے برعکس خدا نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے اپنی زندگی میں دوسرے انسانوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے بارے میں کوئی کام کیئے تھے۔

خدا کے اس سوال پر میں نے اپنی زندگی پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کی کوشش کی تو میری ساری زندگی کی ایک ایک لمحے کی تفصیل ایک لپٹے ہوئے کاغذ پر لکھے مسودے کی شکل میں میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔

"یہ تمہاری سہولت کے لیے ہے۔ اگر تمہاری یادداشت میں سے کچھ چیزیں محو ہو گئی ہوں تو اس سے تمہیں مدد ملے گی۔"

کہنے کو یہ جملہ خدا نے کہا لیکن ایک لپٹا ہوا کاغذ خود بخود میرے ہاتھ میں آ گیا اور میری آنکھوں کے سامنے کھلنا شروع ہو گیا۔

میں نے اپنی زندگی میں کچھ اچھے کام کئے تھے جو اس مسودے میں سنہری حروف میں لکھے تھے۔

پہلا واقعہ محلے کے ایک بچے کے بارے میں تھا جسے میں نے بچپن میں پڑھنا او لکھنا سکھایا تھا۔ میں نے اسے چاند، سورج اور ستاروں کی کہانیاں سنائی تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پگھلنے والی برف اور اس سے بننے والے دریاوں کی داستانیں سنائی تھیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں سے شروع ہو کر دریاوں کے سمندر تک پہنچنے کے سفر کی تفاصیل بتائی تھیں۔ سمندر میں چلنے والی کشتیوں اور ہوا میں اڑنے والے جہازوں کے قصے سنائے تھے۔

اسے عناصر کے خواص کے بارے میں بتایا تھا کہ کس طرح کونسا عنصر کن دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر نئے مرکبات کو جنم دیتا ہے۔

وہ بچہ بڑا ہو کر سائنس دان بنا تھا جس نے کئی ایسے کام کئے تھے جن سے انسانیت کو بہت فائدہ پہنچا تھا۔

اس مسودے میں ایک اور واقعہ بہت بڑے بڑے سنہری حروف میں درج تھا۔ ایک صبح میں سیر کے لیے جارہا تھا کہ راستے میں سور کا ایک چھوٹا سا بچہ مجھے زخمی حالت میں ملا تھا۔

لگتا تھا کسی بڑے جانور نے اسے ہڑپ کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر کسی وجہ سے اسے چھوڑ دیا تھا۔

مجھے وہ چھوٹا سا سور کا بچہ اتنا اچھا اور پیارا لگا کہ میں اسے گود میں اٹھا کر گھر لے آیا۔ گھر لا کر میں نے اس کے زخموں کو صاف کیا۔ اسے مرہم پٹی کی اور پھر کتنے دنوں تک اسے دودھ پلاتا رہا۔ سور کا وہ بچہ کئی ماہ تک میرے پاس رہا۔ جب تھوڑا بڑا ہوا تو میں اسے وہیں چھوڑ آیا جہاں وہ مجھے کبھی زخمی حالت میں ملا تھا۔

میرے اس عمل کو اس مسودے میں خاص طور پر نمایاں کیا گیا تھا۔

میں نے زندگی میں کبھی خدا کو مانا تھا کبھی نہیں۔ کبھی پیغمبروں کی سچائی کو تسلیم کیا تھا کبھی نہیں۔ اور کبھی سرے سے انہیں پس پشت ڈال کر زندگی کے دیگر کاموں میں وقت گزارہ تھا۔ یہ سب اس مسودے میں درج تھا لیکن اس پر کوئی زیادہ زور نہیں دیا گیا تھا۔

ایک دو اور واقعات جن کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا تھا ان میں سے ایک عہد جوانی میں اپنے گاؤں میں لوگوں کو ایسے معاشی نظام کے قیام پر مائل کرنا تھا جس کی وجہ سے سارے گاؤں میں سے غربت اور امارت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس نظام کے تحت سب لوگوں نے اپنے وسائل مجتمع کر لیے تھے اور پھر سب رضاکارانہ طور پر سارے کام کرتے تھے اور مشترکہ محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے وسائل سے سب خوشحالی کی زندگی گزارتے تھے۔

اس نظام کی وجہ سے انسانوں کے چہروں پر پھیلی خوشیوں اور مسرتوں کو خاص طور پر ایک بہت بڑے کارنامے کے طور پر نمایاں کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ زندگی میں میری اکلوتی محبت کا احوال، جس میں میری وجہ سے میری محبوبہ کے چہرے پر پھیلنے والی پہلی مسکراہٹ کا ذکر تھا۔ پھر زندگی کے آخری لمحوں تک اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے اور زندگی کے دکھوں اور خوشیوں میں یکساں طور پر شریک ہونے کے واقعات مرقوم تھے۔ میری اکلوتی محبت کی کہانی میری زندگی کے نمایاں کارناموں میں شمار کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ مسودے میں کئی چیزیں سیاہ حروف میں رقم تھیں۔ سنہری حروف میں لکھی تحریروں کے برعکس سیاہ حروف میں لکھی تحریروں کے ساتھ تفسیری نوٹ تحریر تھے۔

جن میں زندگی کے ایسے غیر شعوری محرکات کا ذکر تھا جن کے زیر اثر وہ کام کئے گئے تھے۔

اپنی اکلوتی محبت کا احوال پڑھتے، جسے میں زندگی کے سفر میں تنہا پیچھے چھوڑ آیا تھا، خدا کے سامنے بھی میری آنکھوں سے آنسوں کے چند قطرے بہہ نکلے۔

میرے آنسوں کے وہ قطرے ان سیاہ حروف میں لکھی تحریروں پر گرے جن کے ساتھ تفسیری نوٹ لکھے گئے تھے۔

حیرت ناک طور پر آنسوں کے وہ چند قطرے ان تحریروں پر پھیلتے چلے گئے یہاں تک ہ وہ سب تحریریں دھندلا گئیں۔ مسودے میں یاتو سنہری حروف میں لکھی تحریریں رہ گئیں یا صرف وہ تفسیری نوٹ جو سیاہ حرفوں میں مرقوم تحریروں کے اردگرد لکھے گئے تھے۔

مسودے پر گرتے آنسو دیکھ کر خدا نے میری زندگی کے واقعات کا مسودہ میرے ہاتھوں سے لے لیا اور کہا: "اس زندگی میں کوئی چیز ایسی اہم نہیں جس کے بارے میں تم سے مزید سوال وجواب کئے جائیں۔ دارالبقا میں تمہارے قیام کو یقینی بنانے کے لیے سنہری حرفوں میں لکھے تمہارے یہ چند کام کافی ہیں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ طویل سفر کے بعد گھر واپسی مبارک ہو۔"

مکالمہ ختم ہوا تو مجھے لگا میں ایک ستارہ ہوں۔ مجھے اپنے ہونے کا شعور ہے۔ اور اس شعور میں ایک ایسی ابدی مسرت کا احساس ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ بس ایک لامحدود مسرت ہے جو روشنی در روشنی ہالوں کی شکل میں پھیلتی چلی جارہی ہے۔

جسم سے باہر ایک دن

اس نے زمین پر چاروں طرف بکھرے ہوئے اپنے اعضا پر نظریں دوڑائیں اور پھر انہیں دوبارہ ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"پروفیسر احمد علی تم دوبارہ اپنے اعضا اکٹھے نہیں کر سکتے۔"

اس نے خود کلامی کے انداز میں سوچا

"اگر میں ان بکھرے ہوئے اعضا کو اکٹھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو۔۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔"

اس کے ذہن میں بڑے بڑے سرخ وسیاہ خوفناک آنکھوں والے چیونٹے گھس گئے۔

اور یہ کام مجھے دن ڈھلنے سے بہت پہلے کرنا ہے۔ ورنہ رات کی تاریکی میں دور تک بکھرے ہوئے یہ اعضا میں کیسے ڈھونڈ سکوں گا۔

اس نے دور گڑھے میں گری اپنی ٹانگ اٹھانے کی کوشش کی۔

"اف جسم سے جدا ہونے کے بعد یہ کس قدر بوجھل ہو رہی ہے۔ میں اپنی پوری کوشش کے باوجود اسے نہیں اٹھا سکتا۔ میں اسے واپس اپنی جگہ پر کیسے رکھوں گا۔ جب یہ ٹانگ میرے جسم کے ساتھ تھی تو کس طرح خود بخود حرکت کرتی تھی۔ صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلانا مجھے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اور پھر کلاس روم میں ان ٹانگوں پر کھڑے ہو کر لیکچر دینا۔۔۔ واہ امزہ آجاتا تھا۔ لیکن اب میں اس ٹانگ کو نہیں اٹھا سکتا۔۔ اور وہ میرے ہاتھوں کی بکھری ہوئی انگلیاں۔۔ اب میرا ان انگلیوں پر کوئی اختیار نہیں۔ نہ میں ان سے قلم پکڑ سکتا ہوں۔ نہ پیانو بجا سکتا ہوں اور نہ کسی دوسرے بدن کو چھونے کی لذت سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ شاید انہیں دوبارہ اپنے ہاتھوں سے جوڑ کر میں وہ سب کچھ پھر کرنے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے دن ڈھلنے سے پہلے کرنا ہے۔

میرا خیال ہے مجھے اپنے دوست رفیق سے مدد لینی چاہیئے۔ آخر آدمی کو تھوڑا سا حقیقت پسند ہونا چاہیئے۔ اور اس وقت حقیقت پسندی یہ کہ میں خود اپنے بکھرے ہوئے اعضا اکٹھے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مجھے اپنے دوست رفیق کے پاس جانا چاہیئے۔ شاید وہ میری کچھ مدد کر سکے۔ ورنہ پھر۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور بڑے بڑے خوفناک آنکھوں والے سرخ وسیاہ چیونٹے دوبارہ اس کے ذہن میں رینگنے لگے۔

وہ چیونٹوں کے خوف سے سہما ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا رفیق کے ہاں پہنچا۔

اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ لیکن گھنٹی کی کوئی آواز اسے سنائی نہ دی۔ اس نے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن پھر بھی گھنٹی نہ بج سکی۔

"یہ واپڈا والے۔۔۔۔۔" اس نے جھنجھلاہٹ میں واپڈا والوں کو ایک غلیظ گالی دینے کی خواہش کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اور دروازہ کھول کر خود اندر چلا گیا۔

پروفیسر رفیق اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھا پھل کھا رہا تھا۔

"یہ آج رفیق کو کیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے خوش آمدید نہیں کہا۔ بلکہ اس نے میرے یہاں آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ لیکن وہ باتیں میری کر رہا ہے۔"

"بے چارہ پروفیسر احمد علی۔۔۔۔۔"

وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔

"اور اس کے بیوی بچوں کا کیا ہو گا؟" اس ی بیوی نے آم کا ایک اور چوسہ لیتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بیوی بچوں کا کیا ہو گا بھابی۔۔۔۔ میں خود ان کی پرورش کروں گا۔" اس نے آگے بڑھ کر رفیق کی بیوی کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لفظ ہوا کے سمندر میں معدوم ہو کر رہ گئے۔

"یہ آج بھابی کو بھی کیا ہو گیا ہے۔ رفیق تو شاید۔۔۔۔۔ لیکن یہ بھابی بھی آج اتنی کٹھور ہو رہی ہے کہ اسے مجھ سے مخاطب ہونا بھی پسند نہیں۔

یہ لوگ میری مدد نہیں کرنا چاہتے۔ شاید رفیق ایک نمبر اور سینئر ہو جانے کے چکر میں خود غرض ہو گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا میں کالج واپس آؤں۔

مجھے عذرا، ٹونی اور پپو سے کہنا چاہیئے۔ وہ میرے بکھرے ہوئے اعضا اکٹھے کرنے میں میری مدد کریں گے۔ آخر عذرا میری بیوی اور ٹونی اور پپو میرے بیٹے ہیں۔ اگر وہ میری مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔"

وہ پروفیسر رفیق اور اس کی بیوی کو الوداع کہے بغیر اپنے گھر چلا آیا۔

سب سے پہلے اس کی ملاقات اپنے پیارے سفید بالوں والے روسی کتے سے ہوئی۔ وہ اب بھی گھر کے دروازے پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کتے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا لیکن وہ بے حس و حرکت بیٹھا دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

"عذرا۔۔۔ عذرا۔۔۔ تم کہاں ہو۔۔۔ اور ٹونی اور پپو تم کہاں ہو۔۔۔شاید پچھلے صحن میں ہوں گے۔"

وہ واقعتاً پچھلے صحن میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ اس کی بیوی اداس اور سوگوار بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ ٹونی اور پپو سبز گھاس پر بیٹھے کھلونوں سسے کھیل رہے تھے۔

"یہ ریچھ تو میں نے ان کے لیئے کل ہی خریدا تھا۔۔"

اس نے آگے بڑھکر اپنی بیوی سے گفتگو کرنا چاہی۔ "دیکھو عذرا، پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ آؤ ہم سب چلیں اور میرے بکھرے ہوئے اعضا اکٹھے کریں۔ زندگی ایک بار پھر ٹانگوں پر دوڑنے لگے گی۔"

لیکن اس کی بیوی خاموش بیٹھی سویٹر بنتی رہی۔ اور اس نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسے پوری دنیا سے بے وفائی کی توقع تھی لیکن اس کی اپنی بیوی اور بچے۔۔۔وہ بھی۔۔۔وہ بھی۔۔۔

اور پھر وہ واپس اسی جگہ آیا جہاں اس کے جسم کے بکھرے ہوئے اعضا پڑے تھے۔ اس نے دیکھا سرخ و سیاہ چیونٹے اس کے تمام اعضا پر چادر کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

اور پھر اس نے ڈاکٹرز کی آواز سنی۔

"آپریشن کامیاب رہا ہے۔ پروفیسر احمد علی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"زیرو آور"

علی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، پوری کائنات جامد و ساکت کھڑی تھی۔ آسمان پر سورج ایک جگہ ٹھہرا تھا۔ ہوا میں اڑنے والے پرندے اپنی اپنی جگہ معلق تھے۔ اس کا جہاز بھی اڑتے ہوئے اچانک فضا میں معلق ہو گیا تھا۔ جہاز کے انجن بند ہو چکے تھے اور کنٹرول سسٹم کے تمام بٹن حرکت سے بے نیاز اپنے اپنے مقام پر فکس تھے۔

اس نے چند لمحوں تک اس انوکھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس کا انسانوں نے اپنی تاریخ میں پہلے کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اسے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

علی نے دوربین کی مدد سے جہاز سے زمین پر دیکھا تو اسے اپنی بیگم گاڑی میں بیٹھی دکھائی دی۔ وہ بھی اس کی طرح پریشان نظروں سے اپنے ارد گرد پھیلی جامد و ساکت کائنات کو دیکھ رہی تھی۔

"شازو۔۔۔۔شازو۔۔۔۔"

علی نے جہاز کا کاک پٹ اُوپر اُٹھا کر اپنی بیگم کو آواز دی۔

"علی۔۔۔۔" وہ جواب میں چلائی۔

علی نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جہاز سے چھلانگ لگا دی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ ٹھہری ہوئی کائنات میں زمین پر گر کر زخمی نہیں ہو گا۔

اس نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ کیونکہ جہاز سے چھلانگ لگانے کے بعد وہ اس طرح تیزی سے زمین کی طرف نہ لڑھکا جیسے اسے نارمل حالات میں گرنا چاہیئے تھا۔ بلکہ وہ تقریباً نا محسوس رفتار سے، روئی کے گالے کی طرح، زمین کی طرف سرکتا رہا۔

اُس نے ٹھہری ہوئی فضا میں تیرتے ہوئے سوچا۔۔۔"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"لیکن وہ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ڈھونڈ سکا۔

"---------Entropy"

اُسے یونیورسٹی کے زمانے میں فزکس کے استاد ڈاکٹر جمیل "انٹراپی پر دیا ہوا لیکچر یاد آیا۔"شاید ماہرین طبعیات کا"انٹراپی"کا مفروضہ عملی صورت اختیار کر چکا ہے۔"اس نے سوچا۔

"لیکن انٹراپی میں تو کائنات کے 'آرڈر' کو مکمل طور پر 'ڈس آرڈر' میں تبدیل ہونا تھا۔ جب کہ اس وقت کائنات مکمل جمود اور سکوت کی حالت میں ہے۔ اور ہر چیز کسی "نامعلوم" لمحے میں ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی ہے۔"

اس کے ذہن میں استدلال اور ردّ استدلال کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

نیچے زمین پر اس کی بیوی گاڑی میں بیٹھی اُس کو ہوا میں آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ علی کی بیگم نفسیاتی علوم کی ماہر تھی۔ وہ مقامی یونیورسٹی مین شعبہ نفسیات کی انچارج تھی۔ اس نے امریکہ کی ایک نامور یونیورسٹی سے نفسیات سے ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔ وہ خواب و بیداری کی حالت میں ذہنی کیفیات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ لیکن کائنات کا یہ "جمود" کوئی ذہنی صورت حال نہیں، بلکہ ایک عملی اور ٹھوس حقیقت تھی۔ اور اس حقیقت کا ڈاکٹر شازیہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سامنا کر رہی تھی۔

"کوما۔۔۔۔"

اُس نے ہوا میں روئی کے گالے کی طرح آہستہ آہستہ تیرتے علی پر نظریں جمائے ہوئے سوچا۔"لیکن 'کوما' تو ایک فرد کے ذہن کے حسّیاتی تعطل کی صورت حال ہے۔ اور یہاں معاملہ ایک فرد نہیں بلکہ پوری وسیع و عریض کائنات کا ہے۔'

"کیا پوری کائنات 'کوما' کی حالت میں جا سکتی ہے؟"اس نے سوچا۔

"جا کیا سکتی ہے۔ 'کوما' کی حالت میں ہے۔" کسی اجنبی آواز نے "جمود" کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اس تشکک پر اُسے سرزنش کی۔

ڈاکٹر شازیہ خیالات کے اسی تانے بانے میں الجھی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل رہی تھیں۔

اس ٹھہری ہوئی کائنات میں صرف علی اور شازیہ دو ذی روح وجود حرکت میں تھے۔ باقی ہر چیز جامد و ساکت تھی۔

اس کا جہاز ابھی تک فضا میں معلق تھا۔ سڑک پر تمام گاڑیاں اپنی اپنی جگہ رُکی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں میں بیٹھے افراد جس حالت میں تھے، اُسی حالت میں ساکت تھے۔

کسی کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر اور دوسرا سائڈ ونڈو پر رکھا تھا۔ کوئی منہ میں سگرٹ دبائے اسے آگ دکھانے کو کوشش کر رہا تھا کہ اس کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا تھا۔

اسکول سے گھروں کو واپس لوٹتے بچے، کتابوں کے بستے گلوں میں لٹکائے، اپنی اپنی جگہوں پر پیوست ہو چکے تھے۔ ان سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی مسلسل ایک ہی سمت میں دیکھے جا رہی تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں آئس کریم پکڑی تھی جو اس کے منہ کے پاس ٹھہری تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے لیکن ایک ہی پوزیشن میں جامد تھے۔

کسی کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا اوپر ہوا میں معلق۔ کسی کا ایک پاؤں آگے تھا اور دوسرا پیچھے۔ کسی کا ایک بازو آگے تھا اور دوسرا پیچھے۔

اس دوران علی ہوا میں روئی کے گالے کی طرح آہستہ آہستہ تیرتے بیگم شازیہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ بیگم شازیہ علی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑی۔

"علی یہ سب کیا ہے۔ پوری کائنات کیوں ٹھہر گئی ہے۔ اور صرف ہم دو۔۔۔ ہم دو۔۔۔ کیوں حرکت میں ہیں؟"

علی نے ڈاکٹر شازیہ کے گال پیار سے سے تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اور اپنے بیٹے حامد کے بارے میں پوچھا۔

"میں اسے سڑک پر ٹرائی سائیکل چلاتے ہوئے چھوڑ آئی تھی۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ علی نے آگے بڑھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ اس نے گاڑی کو دھکا لگا کر اس کی جگہ سے حرکت دینا چاہی لیکن اسے لگا اس کے وجود میں دھکا دینے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ وہ بیگم شازیہ کو وہیں گاڑی میں بیٹھے رہنے کی تلقین کر کے گھر کی طرف بھاگا۔ لیکن وہ فقط روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف حرکت کر سکا۔ اس کے گرد ہر چیز اپنی اپنی جگہ رکی ہوئی تھی۔ راستہ چلتے لوگ، دوکانوں میں شاپنگ کرتے افراد، دفتروں سے باہر آتے کلرک، ہر کوئی۔۔۔ ہر کوئی۔۔ ایک ہی جگہ جما کھڑا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا گھر کے پاس پہنچا تو اس کا بیٹا حامد گھر کے باہر ٹرائی سائیکل پر ایک جگہ کھڑا مسلسل ایک ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"حامد۔۔۔۔ حامد۔۔۔۔ کیا تم مجھے سن سکتے ہو۔۔۔۔؟"

وہ پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے بولا۔ لیکن حامد ٹھہری ہوئی نگاہوں کے ساتھ مسلسل ایک طرف دیکھتا رہا۔۔۔ بے حس و حرکت۔۔۔ ساکت و جامد۔۔۔۔ اور خاموش۔

اپنے ننھے منے بیٹے کی اس حالت پر وہ سسک اُٹھا۔

پھر اپنی بیگم شازیہ کا خیال آنے پر اس کے طرف گیا تاکہ جمود کی اس صورت حال کا کوئی حل ڈھونڈا جا سکے۔

"شازیہ۔۔۔ شازیہ۔۔۔۔ ہمارا حامد بھی 'زیرو آور' میں قید ہو چکا ہے۔"

'زیرو آور' کے لفظ نے جیسے اُس کے ذہن میں بجلی کی لہر دوڑا دی۔ "زیرو آور"۔۔۔۔ "زیرو آور"۔۔۔ "زیرو آور"۔

"زیرو آور" کا خیال آتے ہی وہ اپنی بیگم شازیہ اور بیٹے حامد کو بھول کر اسپیس سنٹر کے کنٹرول روم کی طرف بھاگا۔

کنٹرول روم میں پہنچ کر اس نے دیکھا بڑے کمپیوٹر کی سوئیاں "زیرو آور" پر رکی تھیں۔ اور "زیرو آور" کا مطلب تھا۔۔۔۔ وقت کی قید سے مکمل آزادی۔

اس کی نظریں کمپیوٹر کی 'زیروآور" پر رُکی سوئیوں پر اٹک گئیں۔ اسے اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ہیں خواب میں ہنوز

جب احمد کی آنکھ کھلی اس نے محسوس کیا کمرے میں ایک خوشبو پھیلی تھی۔ اسے اپنا کمرہ کچھ اجنبی سا دکھائی دیا۔

اس نے ایک ایک چیز کی ترتیب یاد کرنے کی کوشش کی تو بظاہر اُسے کسی چیز میں کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی۔ ہر چیز وہیں تھی جہاں اُسے ہونا چاہیئے تھا۔

میز پر پڑے پھول دان میں مصنوعی جاپانی پھول اصلی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ کارنس پر بیٹھی پیتل کی چڑیا، منہ میں خوشہ گندم دبائے، اڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ شیلف میں کتابیں بھی اسی ترتیب سے رکھی تھیں۔ اسٹیریو ابھی تک خوبصورت خواب آور موسیقی کی دھنیں کمرے کی خوشگوار فضا میں بکھیر رہا تھا۔ لیکن اسے لگا یہ جگہ پہلے سے مختلف تھی۔

اُس نے تعجب اور حیرانی سے سوچا کہ یہ جگہ پہلے سے مختلف کیوں ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"ہو سکتا ہے میں ہی وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔" ایک خیال اس کے ذہن میں سر سرایا۔ اس خیال نے اُس کے تجسس کو ہوا دی۔ اُس نے بستر سے اُٹھ کر ملحقہ غسل خانے میں دیوار پر آویزاں آئینے میں جھانکا تو اُسے آئینے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔

"ارے یہ آئینے کو کیا ہوا ہے۔ آج یہ جھوٹ سچ کچھ نہیں بول رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں صورت کی قید سے آزاد ہو چکا ہوں۔" اس نے سوچا۔

"میں اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر روزانہ اپنے دانت صاف کرتا تھا، شیو بناتا تھا، چہرے پر طرح طرح کے لوشن اسپرے کرتا تھا لیکن اب میں اس آئینے میں اپنے وجود کو نہیں دیکھ سکتا۔ کہیں یہ آئینہ اندھا تو نہیں ہو گیا؟ اگر یہ اندھا ہو گیا ہے تو بھی اس میں دھندلا سا عکس تو بننا ہی چاہیئے تھا۔ لیکن یہاں تو سرے سے کوئی عکس نہیں بن رہا۔

اگر یہ آئینہ اندھا نہیں ہوا تو پھر میں۔۔۔ کیا میں۔۔۔ ہونے کی کسی دوسری صورت میں منقلب ہو چکا ہوں۔ اور وہ دوسری صورت کیا ہے؟

کیا میں "شعور خالص" میں تبدیل ہو چکا ہوں۔ "شعور خالص" کے خیال نے اُس کے دل و دماغ کو ایک عجیب سی لذت سے بھر دیا۔"

"احمد تم لا محدود ہو۔"

اس نے آئینے سے توجہ ہٹاتے ہوئے خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ اُس نے غسل خانے سے باہر آ کر کمرے کے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر پڑے پردے کی ڈوری کھینچی اور کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔

سڑک پر گاڑیوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی قطاریں اُسی طرح رینگ رہی تھیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں پھیلے ہوئے انسانی چہروں کے پھول اسی طرح شاداب اور تر و تازہ تھے۔ دور بحر الکاحل خاموش اور پر سکوں نیلے آسمان تک پھیلا تھا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

اُسے محسوس ہوا وہ کوئی خلانورد ہے اور خلائی جہاز سے باہر نکل کر خلا میں چہل قدمی کر رہا ہے۔

"احمد یہ کونسی صورت حال ہے؟" اُس نے اپنی بے وزنی کی کیفیت کے بارے میں خود سے سوال کیا۔ اور پھر فٹ پاتھ پر چلتا شہر کی اہم سڑک ٹیلی گراف کی طرف چل پڑا۔

سڑک کنارے اس کی پرانی ڈاٹسن کھڑی تھی۔ اس نے ایک لمحہ رک کر ڈاٹسن کی طرف دیکھا اور پھر ٹیلی گراف کی طرف پیدل اپنا سفر جاری رکھا۔ اسے بے وزنی کیفیت میں پیدل چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

راستے میں اُسے شناسا چہرے دکھائی پڑے لیکن اُس نے کسی طرف توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پسندیدہ کافی ہاؤس کے سامنے سے بھی خاموشی سے گزر گیا۔ وہ عموماً پہروں وہاں بیٹھ کر کافی پیتا۔ یونیورسٹی کی لڑکیوں اور لڑکوں سے گپ شپ کرتا۔ لیکن آج اس نے نظر اُٹھا کر اپنے پسندیدہ کافی ہاؤس کی طرف نہ دیکھا۔

دراصل وہ نئی صورت حال کی لذت سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اُسے بے وزنی کی اس کیفیت میں گھومنا پھرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی باقی خواہشات اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھیں۔ حالانکہ اس حالت میں وہ اپنی کوئی بھی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ لیکن اسے اپنی خواہشات اس قدر بیکار محسوس ہوئیں کہ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

ایسے میں اُسے اپنی کئی خواہشیں یاد آئیں جن کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا لیکن اب وہ ان سے آزاد ہو چکا تھا۔

انہی سوچوں میں گم وہ اپنی پسندیدہ سڑک ٹیلی گراف ایونیو پر پہنچا تو اسے بہت بھلا محسوس ہوا۔ خوبصورت انسانی چہروں کا سیلاب اب بھی حسب معمول ٹیلی گراف پر بہہ رہا تھا۔ وہ سب لوگ بھی وہیں موجود تھے جو ہر روز ہوا کرتے تھے۔ خوانچہ فروش لڑکیاں اب بھی سڑک کے دونوں طرف اپنے اپنے اڈوں پر سامان بیچ رہی تھیں۔

شہر کی مشہور شاعرہ جولیا ونو گریڈ اُسی طرح گلے میں تھیلا لٹکائے، ایک ہاتھ میں اپنی کتاب سٹریٹ سکنز کی کاپیاں پکڑے، دوسرے ہاتھ سے لوگوں پر رنگ برنگے بلبلے اُڑا رہی تھی۔ بچے اُس کے اڑائے ہوئے بلبلے پکڑنے کے لیے ماؤں سے ہاتھ چھڑا کر ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

وہ انسانوں کے اس ہجوم میں گھومتے ہوئے بور ہو کر آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا اُس کے دوستوں اور عزیز و اقارب کا ایک ہجوم سوگوار بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی اس کے جسم سے لپٹی رو رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا وہ آگے بڑھ کر اپنی بیوی کو تسلی دے۔ لیکن پھر وہ اپنے جسم سے اٹھتے بُو کے بھبھوکوں سے گھبرا کر دوبارہ گھر سے باہر چلا گیا۔

صدرِ محترم

سڑک پر جہاں تک نظر جاتی تھی لوگ ہی لوگ تھے۔ انسانی سروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں، لڑکے، بوڑھے اور بچے تھے کہ چلے آرہے تھے۔ آج اتنے لوگ کہاں سے سڑکوں پر نکل آئے تھے کسی کو اندازہ نہیں تھا۔

نہ انہیں کسی نے سڑکوں پر آنے کی دعوت دی تھی۔ نہ ان کا کوئی لیڈر تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ایک تار ہے جس میں وہ سب پروئے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی منزل کہاں ہے۔

وہ سب ملک کے دارالحکومت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں جا کر انہیں کیا کرنا تھا اس کا انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بس وہ چل رہے تھے۔ چل رہے تھے۔ اور چلتے چلے جارہے تھے۔

وزیر داخلہ کو اتنے لوگوں کے دارالحکومت کی طرف بڑھنے کی خبر ملی تو اس نے فوراً اس کی اطلاع صدر محترم کو دی۔ اس نے صدر محترم کو یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں روکنے کے لیے ہمارے پاس کوئی فورس نہیں۔ ہم کچھ بھی کرلیں ان کے سامنے کتنی بھی رکاوٹیں کھڑی کرلیں وہ رکنے والے نہیں۔ لگتا ہے وہ دارالحکومت پہنچ کر رہیں گے۔

وزیر داخلہ کی رپورٹ سن کر صدر محترم کی بتیسی کھل اٹھی۔ اپنے میلے دانتوں اور پر ہوس آنکھوں کے ساتھ ہنستے ہوئے صدر محترم نے فرمایا جیسے بھی ہو ہمیں لوگوں کے اس سیلاب کو دارالحکومت پہنچنے سے روکنا ہے۔

"صدر محترم میں نے سارے ملک کے پولیس انسپکٹروں سے درخواست کی ہے کہ وہ لوگوں کو دارالخلافے کی طرف بڑھنے سے روکیں لیکن سب نے معذرت کرلی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عوام کے اس بپھرے ہوئے سمندر کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں۔" وزیر داخلہ نے خوف زدہ مگر پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

صدر محترم نے میلے دانتوں اور ہوس بھری آنکھوں سے ہنستے ہوئے وزیر داخلہ سے کہا:

"اگر سارے ملک کے پولیس انسپکٹر انسانوں کے اس امڈتے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو فوج کے چیف کو کال کرو اور اسے کہو کہ وہ فوجیوں کو حکم دے کہ وہ کروڑوں انسانوں کو دارالحکومت کی طرف بڑھنے سے روکیں۔"

"صدر محترم میں نے کوشش کی تھی کہ فوج کے کمانڈر انچیف سے رابطہ کروں لیکن کمانڈر انچیف کا پرائیوٹ سیکرٹری، جو کہ ایک کرنل ہے، جس کا مجھے نام یاد نہیں، کہتا ہے کہ میں کمانڈر انچیف سے بات نہیں کر سکتا۔" وزیر داخلہ نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ کروڑوں لوگ دارالحکومت کی طرف بڑھے آرہے ہیں؟" صدر محترم نے وزیر داخلہ سے پوچھا۔

پھر خود کلامی کرتے ہوئے بولے: "نہ جانے یہ کروڑوں لوگ دارالحکومت آکر کیا کریں گے۔ آخر اتنے لوگوں کو یہاں آنے کیا ضرورت تھی۔ ہم ہیں ناں یہاں پر۔ ان کے نمائندے۔ ان کو دارالحکومت کا راستہ کس نے دکھایا ہے؟"

ان کی خود کلامی سے بھی ان کی ناراضگی عیاں تھی۔ وزیر داخلہ نے صدر محترم کی خود کلامی کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہم نہیں جانتے صدر محترم انہیں دارالحکومت کی طرف کس نے بھیجا ہے۔ ظاہراً کوئی ان کی قیادت نہیں کر رہا۔ کچھ سیاست دانوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ طرح طرح سے انہیں دارالحکومت آنے سے روکا لیکن وہ رکتے دکھائی نہیں دیتے۔ بس بڑھے چلے آرہے ہیں۔"

"اچھا مجھے فوج کے کمانڈر انچیف سے ملاؤ۔ میں اسے خود حکم دوں گا کہ وہ جائے اور جا کر اتنے لوگوں کو دارالحکومت کی طرف آنے سے روکے۔" صدر صاحب نے غصے سے چلّاتے ہوئے وزیر داخلہ کو ہدایت کی۔

صدر صاحب کے کہنے پر وزیر داخلہ نے فون کے نمبر گھمائے تو دوسری طرف سے اسی کرنل کی آواز پھر سنائی دی: "میں نے تمہیں پہلے منع کیا تھا کہ کمانڈر انچیف صاحب تم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ تم پھر ہمیں کال کر رہے ہو۔"

وزیر داخلہ نے صدر محترم کی موجودگی میں تھوڑا حوصلہ دکھاتے ہوئے کہا: "کرنل صاحب اب میں نہیں صدر محترم کمانڈر انچیف صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ صدر محترم کون ہے۔ اس ملک میں صرف ہم محترم ہیں۔ ہمارے علاوہ یہ دوسرا محترم کون پیدا ہو گیا ہے۔" کرنل صاحب نے دھاڑتے ہوئے وزیر داخلہ کو جواب دیا۔

"کرنل صاحب، صدر محترم آرمڈ فورسز کے سپریم کمانڈر ہیں۔" وزیر داخلہ نے وضاحت کی۔

"ہم کسی ایسے عہدیدار کو نہیں جانتے۔ ہم صرف اپنے کمانڈر انچیف کو جانتے ہیں۔ اور وہ اس وقت کسی اور محترم سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں۔"

وزیر داخلہ کی جب فوج کے کمانڈر انچیف کے سیکرٹری، جسے بعض اوقات رعب و دبدبے کے اظہار کے لیے چیف آف اسٹاف بھی کہا جاتا ہے، بات ہو رہی تھی صدر محترم پاس ہی کھڑے تھے۔ وزیر داخلہ کی گفتگو سن کر ان کے چہرے پر کچھ مایوسی کے تاثرات ابھرے۔ ان کی بتیسی کچھ لٹک سی گئی۔ اور پر ہوس آنکھوں سے بھی مایوسی ٹپکنے لگی۔ انہوں نے مایوسی کے عالم میں وزیر داخلہ سے پوچھا:

"لوگ کہاں تک پہنچے ہیں؟"

وزیر داخلہ نے جواب دیا: "وہ ابھی دارالحکومت سے کچھ فاصلے پر ہیں۔ اگر اسی طرح چلتے رہے تو آج رات سے پہلے دارالحکومت پہنچ جائیں گے۔"

صدر محترم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر وزیر داخلہ سے کہا: "ہماری پارٹی کے لوگ کہاں ہیں۔ کیا ہم انہیں متحرک نہیں کر سکتے۔ وہ آئیں اور آکر انسانوں کے اس سیلاب کو دارالحکومت کی طرف بڑھنے سے روکیں؟"

"صدر محترم۔ ہماری پارٹی کے لوگ بھی انہی لوگوں سے مل گئے ہیں جو دارالحکومت کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ اب وہ سب ایک پارٹی ہیں۔ ان میں کوئی تقسیم نہیں۔ کسی کے پاس کوئی پرچم نہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرے۔ وہ سب ایک ہیں اور بڑھے چلے آرہے ہیں۔" وزیر داخلہ نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں وہ سب لوگ یہاں آکر کیا کریں گے؟" صدر محترم نے خوف زدہ آواز میں وزیر داخلہ سے پوچھا۔

"صدر محترم اس کا کسی کو کوئی اندازہ نہیں۔ وہ کوئی نعرہ بلند نہیں کر رہے۔ کوئی مطالبہ نہیں کر رہے۔ بس دارالحکومت کی طرف چل رہے ہیں، مسلسل چل رہے ہیں، اور چلتے ہی آرہے ہیں۔ یہاں آکر وہ کیا کریں گے اس کے بارے کچھ کہنا مشکل ہے۔"

صدر صاحب نے وزیر داخلہ سے کہا: "لو مجھے آخری کوشش کرنے دو۔ میں ہاٹ لائن پر کمانڈر انچیف سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ وہ فوج کو حکم دے کر اتنے سارے لوگوں کو دارالحکومت کی طرف بڑھنے سے روکے۔"

یہ کہہ کر صدر محترم نے ہاٹ لائن پر کمانڈر انچیف کو فون کیا۔ دوسری طرف کمانڈر انچیف نے ہیلو کہا تو صدر محترم نے کمانڈر انچیف سے کہا: "میں صدر مملکت بول رہا ہوں۔"

"جی بولیں۔۔۔" کمانڈر انچیف نے پرسکون لہجے میں صدر مملکت کو جواب دیا۔

"مجھے وزیر داخلہ نے بتایا ہے کہ کروڑوں لوگ دارالحکومت کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ ملک بھر کے پولیس انسپکٹروں نے اتنی بڑی تعداد میں دارالحکومت کی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کو روکنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ فوج ان لوگوں کو دارالحکومت آنے سے روکے۔"

کمانڈر انچیف نے صدر محترم کی بات سنی تو کھنکھناتی ہوئی آواز میں جواب دیا: "صدر محترم، دارالحکومت ان کا ہے اگر وہ دارالحکومت آرہے ہیں تو ہم انہیں یہاں آنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ میں معذرت

چاہتا ہوں۔ فوج اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر سر حدوں پر دشمن فوج ہمارے ملک کی طرف بڑھ رہی ہے تو ہم ابھی جا کر ان کو روکتے ہیں۔ لیکن اگر اپنے لوگ اس طرف آرہے ہیں تو ہم انہیں یہاں آنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ دارالحکومت ان کا ہے۔ وہ جب چاہیں یہاں آسکتے ہیں۔"

کمانڈرانچیف کا جواب سن کر صدر محترم نے اپنے دانت کٹکٹائے لیکن اس قدر آہستگی کے ساتھ کہ کمانڈرانچیف تک ان کے دانت کٹکٹانے کی آواز نہ پہنچے۔

اس سے پہلے کہ صدر محترم کمانڈر انچیف کو خدا حافظ کہتے اس نے خود فون بند کر دیا۔ صدر محترم اور وزیر داخلہ نے ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں کمانڈر انچیف کی گستاخی کی خاموش اطلاع دی اور پھر اس گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے دارالحکومت کی طرف بڑھتے لوگوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

"وزیر داخلہ۔"

"جی صدر محترم۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے نیوی چیف سے ہاٹ لائن پر بات کرنی چاہیئے۔" انہوں نے اپنی بتیسی کٹکٹاتے ہوئے وزیر داخلہ سے پوچھا۔

"صدر محترم، اگر کمانڈر انچیف فوج کے ذریعے انسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے تیار نہیں تو نیوی چیف کے پاس تو ایسی کوئی نفری نہیں ہوتی۔ ویسے بھی وہ سمندروں میں کاروائی کرتے ہیں۔ خشکی پر وہ کیا کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر کچھ سوچو۔ دارالحکومت کی طرف بڑھتے ہوئے ان انسانوں کو کیسے روکنا ہے۔ اگر اتنے سارے لوگ یہاں پہنچ گئے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔"

دارالحکومت میں وزیر داخلہ اور صدر محترم میں ڈائیلاگ چل رہا تھا اور ادھر دارالحکومت کی طرف بڑھنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ جس گاؤں یا شہر سے گزرتے اس کے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔

وہ چل رہے تھے، اور مسلسل چل رہے تھے، اور چلتے ہی چلے آرہے تھے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ وہ چلتے چلتے دارالحکومت پہنچے تو سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ دارالحکومت میں انہیں داخل ہونے سے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔

دارالحکومت میں داخلے کے بعد اچانک ان میں جوش و خروش پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ ان کی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ان کے گھسٹتے قدموں میں سختی آنا شروع ہو گئی۔ وہ ایک ساتھ قدم اٹھانے اور زمین پر رکھنے لگے۔ کروڑوں انسانوں کے ایک ساتھ قدم زمین سے اٹھانے اور رکھنے سے دلوں کو دہلا دینے والے ایک مارچ کی صدا پیدا ہونے لگی۔

وہ سب ایوان صدر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ ایوان صدر میں سنائی دینے لگی تھی۔ جیسے جیسے وہ ایوان صدر کے قریب آرہے تھے ان کے قدموں کی چاپ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ چاپ اتنی بلند تھی کہ صدر محترم اور وزیر داخلہ کے کانوں کے پردے قدموں کی اس چاپ سے تھر تھرانے لگے۔ صدر محترم اور وزیر داخلہ نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونسی، پھر ائیر پلگ ٹھونسے، لیکن کروڑوں انسانوں کے قدموں کی صدا بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ ان کے کانوں میں ٹھنسی روئی اور ائیر پلگ اس آواز کو روکنے میں ناکام ہو گئے۔

اب صورت حال یوں تھی کہ وزیر داخلہ اور صدر محترم ایوان صدر میں بند تھے۔ کروڑوں لوگ ایوان صدر کے باہر جمع زور زور سے قدم اٹھا کر زمین پر مار رہے تھے۔ ان کے قدموں سے ایوان صدر کے ارد گرد کی ساری زمین لرز رہی تھی۔ پھر کروڑوں انسانون نے مکھیوں کی طرح آہستہ آہستہ بھنبھنانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی بھنبھناہٹ میں تیزی آتی گئی۔

ان کے قدموں کی چاپ سے زمین دہل رہی تھی۔ ان کی بھنبھناہٹ کے بڑھتے ہوئے شور سے ایوان صدر میں وزیر داخلہ اور صدر محترم خوف سے سمٹنا شروع ہو گئے۔ وہ سمٹتے چلے گئے، سمٹتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ دونوں سانپوں میں تبدیل ہو گئے۔

سانپوں میں تبدیل ہو کر انہوں نے ایوان صدر سے رینگتے ہوئے فرار ہونا چاہا لیکن جیسے ہی باہر نکلے لوگوں کے قدموں تلے کچلے گئے۔

لوگ جس طرح سارے ملک سے مارچ کرتے آئے تھے۔ سانپوں کے کچلے جانے کے بعد ویسے ہی واپس چلے گئے۔

اب ایوان صدر خالی ہے۔ اور لوگ اپنے معاملات خود چلاتے ہیں۔ بغیر کسی صدر اور وزیر داخلہ کے۔ ان کی زندگیاں ان کے بغیر زیادہ بہتر انداز میں چل رہی ہیں۔

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطور لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشایئے لکھے۔

جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فنکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیر نظر کہانیوں کے مجموعے کے علاوہ وہ تین ناولوں 'مٹی کا بیٹا'، 'نسل سوختہ' اور 'شب گزیدہ سحر' کے اور کہانیوں کے ایک مجموعے 'مکالمے کا قتل' کے مصنف ہیں۔

نثری نظموں کا ایک مجموعہ 'برف میں کھلا پھول' زیر اشاعت ہیں۔ تاحال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔